پاکستان تناظر

2012ء

مجوزہ دستاویز نمبر 3

قیمت:100روپے

31ویں کانگریس 2012ء

فہرست

واقعات، واقعات اور واقعات

ناکام ریاست کے ہچکولے

برباد معیشت کی سماجی اذیت

قوم پرستی کا آسیب اور بنیاد پرستی کا ناسور

ریاست، پیپلز پارٹی اور عوام

سیاسی ہیجان، نوجوان نسل اور طبقاتی شعور

واقعات، واقعات اور واقعات

سنا ہے شہر میں زخمی دلوں کا میلہ ہے
چلیں گے ہم بھی مگر پیرہن رفو کر کے
محسؔن نقوی

وقت بدل رہا ہے۔ یہ کبھی بھی ایک جیسا نہیں رہتا، تغیر وقت کی بنیادی خصلت ہے۔ مگر اکثر ایسے عہد اور ادوار آتے ہیں جن میں بظاہر جمود، سکوت اور ٹھہراؤ کی کیفیات غالب آ جاتی ہیں۔ جیسے سب کچھ رک سا جاتا ہے۔ تحریک اور انقلاب کا تصور بھی محال ہو جاتا ہے۔ اگر چھوٹی چھوٹی تحریکیں اٹھتی بھی ہیں تو ان کی پسپائیاں جمود کی ابدیت کے تصور کو مزید تقویت دیتی ہیں۔ سب کچھ اٹل، قطعی اور طے شدہ سا معلوم ہوتا ہے۔ سناٹا معمول اور اکتاہٹ وطیرہ بن جاتا ہے۔ مایوسی، بدگمانی اور پژمردگی انسانی روح اور اعمال کو فتح کر لیتے ہیں۔ ان ادوار میں ایسے مزاج سے مطابقت رکھنے والی سوچیں، فکر، فلسفے، خیالات، تصورات اور نظریات ہی مقبولِ عام ہوتے ہیں۔ ان خیالات میں ایک لازمی مشترک قدر یہ ہوتی ہے کہ یہ تغیر و تبدل کا نہ صرف انکار کر دیتے ہیں بلکہ رجعت کا پرچم تھام کر انقلابی نظریات کے خلاف مزاحمت کا اعلان بھی کر دیتے ہیں۔ مگر اسی ماحول اور معروض میں سطح کے نیچے سب کچھ تبدیل ہو رہا ہوتا ہے۔ تبدیلی عموماً نازک اندام، خوش مزاج اور عاجز طبع ہوتی ہے مگر جب بار بار اس کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے تو اس کا ردِ عمل انتہائی سخت گیر اور ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے۔ اس تغیر کے بطن میں ہمیشہ مثبت اور منفی دونوں رجحان اور امکان پائے جاتے ہیں۔ پھر عہد بدلتا ہے اور تبدیلی ایک چنگاری بن کر سلگنا شروع کر دیتی ہے۔ ایسے ادوار میں انقلابیوں اور مارکسیوں کی یہ بنیادی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ٹھوس معروضی حقائق کی روشنی میں سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے تبدیلی کے مثبت رجحان اور امکانات کو پایہ

تکمیل تک پہنچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔

گزشتہ نسل جواب بوڑھی ہو رہی ہیں اس نے کچھ اسی قسم کے دور میں زندگی گزاری۔ وہ بلاشبہ ایک اعصاب شکن اور صبر آزما دور تھا۔ ظلمت اور جہالت کا ننگا راج تھا اور روشنی اور امید کی ایک کرن بھی ناپید تھی۔ بڑے بڑے بڑھک باز اور نامور انقلابی اور دانشور اسی ظلمت اور جہالت کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر اس دور میں بھی بین الاقوامی مارکسی رجحان غیر متزلزل انداز میں استقامت کے ساتھ تحریک اور انقلاب کا تناظر بناتا اور اس کے لیے لڑتا رہا۔ لیکن دنیا بھر میں حالیہ واقعات نے اپنے آغاز میں ہی مارکسیوں کی کم سے کم نفسیاتی، نظریاتی اور اخلاقی برتری کو ثابت کر دیا ہے، اگلے مرحلوں میں ان واقعات میں مداخلت انکی سیاسی اور نظریاتی فتح کے امکانات کو روشن کر دے گی۔

ان پرانے، بوسیدہ، فرسودہ اور قدامت پسند خیالات اور نظریات کا ایک اور المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تبدیلی کے اس عمل میں ان میں سے کچھ بے شرمی اور ہٹ دھرمی سے ماضی کی باقیات کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں مگر چند ایک بالکل اپنے الٹ میں بدل کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتے ہیں اور تبدیلی کے بالکل آغاز پر ہی یہ واویلا کرنا اور غل مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے اور حتمی منزل آ بھی چکی ہے۔ یہ کھیل کے شروع ہوتے ہی اس کے خاتمے کا اعلان کر دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے بہت جلد مایوس ہو کر دوبارہ اپنے ماضی کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ماتم کرنا اور رونا پیٹنا یا پھر تاریخ کے میدان میں اترے ہوئے انقلابی عوام کو ہی کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی عملیت پسندانہ (pragmatic) طرزِ فکر کی وجہ سے تبدیلی کے جدلیاتی عمل اور اس کے مختلف مراحل، جہتوں اور نوعیت کو سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں۔ اس انقلابی تبدیلی کو اپنی تکمیل سے قبل مخصوص عبوری مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں اور اسے ناقابلِ مراجعت ہونے سے پہلے اپنی نمائندہ قوتوں کو تلاش، تعمیر اور استوار کرنا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ تبدیلی اپنے منفی رجحان اور امکان کی طرف رخ کر لیتی ہے۔ ایسے میں پھر مارکسیوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تمام تر صورتحال کا مختلف پہلوؤں سے تجزیہ کرتے ہوئے عوام کی درست سمت میں رہنمائی

کریں۔موجودہ عالمی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کسی صورت نہیں کہا جا سکتا کہ عالمی انقلاب وقوع پذیر ہو چکا ہے مگر یہ ہر صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی جانب عبوری دور کا آغاز ہو چکا ہے۔

2011ء اختتام پذیر ہوا لیکن وقت اور عہد کے کردار اور رفتار پر ان مٹ نقوش ثبت کر گیا۔جدید تاریخ نے اتنا بھرپور، سنسنی خیز، تندوتیز اور سبق آموز سال نہیں دیکھا۔واقعات کی برق رفتاری نے دنیا کے ہر خطے اور برِاعظم کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور جس طرح کامریڈ ٹیڈ گرانٹ کہا کرتے تھے کہ واقعات، واقعات اور صرف واقعات ہی تاریخ کے دھارے کا رخ متعین کرتے ہیں تو یوں گزشتہ سال تاریخ کے سفر کے حوالے سے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔عرب بہار، امریکی خزاں اور یورپ کے واقعات نے ہر جگہ معیشت، سیاست، ثقافت اور انسانی شعور کی کایا پلٹ دی۔ایک توانا اور تازہ دم نئی نسل عالمی انقلاب کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے لیکن یہ سفر بے شمار نشیب و فراز اور مشکلات سے عبارت ہے۔عالمی سرمایہ دارانہ نظام اپنی تمام تر تنگ دامنی، سفاکی، بدنیتی اور جعلسازی کے ساتھ پوری دنیا کے سامنے عریاں ہو گیا۔ پارلیمانی جمہوریتیں، مطلق العنان بادشاہتیں واقعات کے سیلِ رواں میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ گزشتہ برس 8 ریاستوں کی حکومتوں کے سربراہان کو اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے لیکن اس کے باوجود کسی بھی جگہ استحکام کا شائبہ تک نہیں ہوا۔حالیہ بحران نے ایک نئے معمول کو جنم دیا ہے جو انتشار، خلفشار اور عدم استحکام کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔حکمران طبقات محض انگشت بدنداں ہیں اور کچھ بھی سوچنے، سمجھنے اور کرنے سے قاصر ہیں۔لیکن وہ ہر صورت میں اپنی دولت اور سرمائے کے نظام کو بچانے کی بے ہنگم کوششیں کر رہے ہیں۔مگر وہ جس نظام پر براجمان ہیں اس کی معیشت ایک ایسے سرطان میں مبتلا ہو چکی ہے جس کا علاج ابھی تک ایجاد نہیں ہو سکا۔ٹریکل ڈاؤن اکنامکس سے کینیشئین ازم اور گلوبلائزڈ نیولبرل اکانومی سے واپس پروٹیکشنزم تک سب کچھ آزمایا جا چکا مگر ہر نسخہ مرض کو اور بھی مشتعل کرنے کا باعث بنا ہے۔بقول میر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔قرضوں کی مصنوعی آکسیجن نے سانس کو بحال کرنے کی بجائے اور

بھی محبوس کر دیا ہے۔ مگر مٹھی بھر آدم خور طفیلئے اپنے انجام سے بے خبر آج بھی گِدھوں کی طرح اس قریب المرگ معیشت کا گوشت نوچ رہے ہیں۔ سٹاک ایکسچینج اور منڈیاں چھوٹے بچوں کی طرح خوفزدہ ہیں۔ یہ پیداواری قوتوں کی فیصلہ کن بغاوت ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی متروکیت اور استرداد کا نقارہ بج رہا ہے۔ یہ حقیقت اب روزمرہ کے تجربات سے ہوتی ہوئی عوامی شعور کا حصہ بنتی جا رہی ہے کہ یہ غاصبانہ نظام ایک طرف تو اب پیداواری قوتوں کو ایک انچ بھی بڑھاوا نہیں دے سکتا اور عوامی ترقی کے رستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے مگر دوسری طرف اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس نظام پر براجمان حکمران طبقات نے اپنی لوٹ مار اور ہوس کی شرح کو بڑھانے کے لیے اس کرہ ارض کو بھی اس قدر برباد کر دیا ہے کہ اب اس سیارے پر انسانوں کی بقا مشکل ہوتی جا رہی ہے اور ہر خطے میں انسانوں کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ قدرتی آفات، زلزلے، طوفان اور سیلاب جو پہلے کبھی شاذ و نادر ہی خبروں کا حصہ ہوا کرتے تھے اب خبروں کا معمول بنتے جا رہے ہیں اور لاکھوں سال کی انسانی محنت سے مسلح سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے ان کا انسداد اور انسانی وسائل کا تحفظ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے منصوبہ سازوں کے منافعوں کا اس قسم کے منصوبوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا اس لیے انسانی جانوں کا ضیاع بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ 19 جنوری 2012ء کے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ برس دنیا بھر میں قدرتی آفات سے 366 ارب ڈالر کا نقصان ہوا۔ قدرتی آفات کے سال بھر میں کل 302 واقعات ہوئے جن میں 30000 سے زائد افراد ہلاک ہوئے اور مجموعی طور پر 20 کروڑ 60 لاکھ لوگ متاثر ہوئے۔ پاکستان میں بھی گزشتہ دو برسوں میں سیلاب سے کروڑوں لوگ بے گھری اور بیکاری کا شکار ہوئے ہیں۔ سیاسی واقعات کی طرح اس قسم کے تباہی کے واقعات اور ان کے نتیجے میں مستقل عدم تحفظ کا احساس بھی نظام کے بارے میں سنجیدہ سوالات کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔

اگر 2011ء میں عظیم واقعات رونما ہوئے ہیں تو 2012ء میں بھی اسی قسم کے واقعات رونما ہونے کے واضح امکانات نظر آ رہے ہیں اس سال کا آغاز نائیجیریا میں ہڑتالوں کی ایک لہر

سے ہوا۔اسی قسم کے واقعات سارے افریقہ میں وقفے وقفے سے رونما ہو سکتے ہیں۔جو کچھ رومانیہ میں ہو رہا ہے ایسا ہی کچھ آئندہ برسوں میں شمالی یورپ کے دیگر ممالک میں ہو سکتا ہے۔عرب انقلاب کی چنگاری بھی ابھی بجھی نہیں ہے وہ بھی وقتاً فوقتاً سلگتی اور بھڑکتی رہے گی۔یورپ ایک بارود کے ڈھیر پر ہے جہاں سے وقفوں وقفوں سے دھماکوں کی آوازیں آتی رہیں گی۔برطانیہ بالخصوص ایک سماجی دھماکے کے دہانے کی طرف لڑھک رہا ہے۔مگر اس سال امریکہ،روس، وینزویلا اور میکسیکو کے انتخابات بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہوں گے۔ماضی قریب میں بھی جہاں جہاں انتخابات ہوئے ہیں وہاں سیاسی بحرانات اور تحریکوں نے جنم لیا ہے۔پاکستان میں بھی اس سال قبل از وقت انتخابات ہو سکتے ہیں اور اگر یہ معینہ وقت پر یعنی 2013ء کے اوائل میں بھی ہوتے ہیں تو انتخابات سے قبل یا بعد چند ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں جو سارے سیاسی منظرنامے کو ہی یکسر تبدیل کر سکتی ہیں۔

اگرچہ خود حکمران طبقے کے رکھوالے عوام کی ممکنہ بغاوت سے نہ صرف خود ڈرے ہوئے ہیں بلکہ اپنے طبقے کو بھی ڈرا رہے ہیں مگر اس کے باوجود بہت سے تجزیہ نگار آج بھی پاکستان کو کسی بھی بڑی انقلابی لہر سے مبرہ قرار دے رہے ہیں جیسے پاکستان زمین کی جگہ کسی اور سیارے پر ہے۔یہ پاکستان کے مخصوص ثقافتی،نفسیاتی،سماجی اور سیاسی ماحول کو حقیقی معنوں میں سمجھے بغیر اس کا ہوا بنا کر اسے اجتماعی شعور پر مسلط کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔مگر زیادہ پہلے کی بات نہیں ابھی ایک سال قبل جب تیونس میں زین العابدین کا تختہ الٹا جا رہا تھا تو عالمی ماہرین اور مصر کے حکمران یہ فرما رہے تھے کہ مصر میں تو بالکل الٹ صورتحال ہے۔شرحِ نمو بھی اچھی ہے اور جمہوری سیٹ اپ بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔یہاں ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔مگر ان تمام ارشادات کے سالوں یا مہینوں بعد نہیں بلکہ دنوں بعد مصر میں عوامی لاوا پھٹ پڑا تھا۔عرب انقلاب اور آکوپائی وال سٹریٹ کی تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے سرمایہ دارانہ عالمگیریت کی وجہ سے جنم لینے والی عوامی اور طبقاتی بین الاقوامیت کے مارکسی نظریے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔اسرائیل کے دارالحکومت تل ابیب میں ''ایک مصری کی طرح چلو'' کے

سینکڑوں پلے کارڈز اور آکوپائی وال سٹریٹ کی کال پر اس کی حمایت میں ایک ہی دن میں دنیا کے تمام براعظموں کے 900 سے زائد شہروں میں احتجاجی مظاہرے نہ صرف قومی اور نسلی شاونزم کے منہ پر طمانچہ ہیں بلکہ سٹالنزم کی محدوددیت اور استرداد کا واشگاف اعلان بھی ہیں۔ذرائع پیداوار بالخصوص ذرائع ابلاغ کی ترقی،محنت کی عالمی پیمانے پر سماجی تقسیمِ کار اور محنت کشوں کے دکھ،تکلیف اور مصائب کے مشترکہ احساس کے جدید عہد میں ان عظیم بوڑھے انقلابیوں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کا وہ نعرہ کتنا تروتازہ اور معطرمحسوس ہوتا ہے جو آج نوشتۂِ دیوار بن چکا ہے کہ ''دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ''۔

اس لیے ان تمام پیٹی بورژوا دانشوروں اور ٹی وی ٹاک شوز کی یلغار کے باوجود پاکستان کے محنت کش عوام اور نوجوان بھی اسی قسم کی ذلت اور محرومی سے دوچار ہیں جو اس کرّے کی اکثریت کا مقدر بنا دی گئی ہے۔اگرچہ چھوٹی چھوٹی تحریکوں کی پسپائیوں کی وجہ سے ابھی بیدلی اور یاسیت تحریک پر حاوی ہوئے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لینا چاہئے کہ عوامی تحریک اور شعور کو فیصلہ کن شکست ہو چکی ہے۔'تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم'۔ 2008ء کے بعد سے تحریک گھائل ضرور ہے مگر اس نے ہار نہیں مانی۔وہ پھر تاریخی عمل میں اپنا اظہار کرے گی۔اس کے راستے میں جو جو مشکلات اور کٹھن مراحل آئیں گے ان کا تفصیلی تجزیہ کرنے اور اسے پایۂِ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک منظّم اور سائنسی لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے۔بالخصوص اس بات کو مدِنظر رکھنا ہو گا کہ عالمی معاشی بحران،اس کے نتیجے میں جاری جنگیں، مختلف ملکوں کے عوامی ابھار اور ان کے مختلف مراحل اور خاص طور پر اس خطے میں معاشی،سیاسی اور فوجی پیشرفتیں پاکستان کے محنت کش طبقے کی قیادت کو کیا اقدامات کرنے پر مجبور کریں گی اور ان اقدامات کے محنت کش طبقے کے شعور پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

نظریات جو گزشتہ کئی عشروں سے انتہائی کم قیمت اور بے مایہ چیز سمجھے جاتے تھے تاریخ کے اس اہم ترین موڑ پر دوبارہ اپنی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کروا رہے ہیں۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد خود بورژوا نظریہ دانوں نے نظریات کی بے مائیگی کو ایک اصول کی حیثیت دے دی

تھی۔نظریات کی عدم ضرورت کو ہی ایک نظریے کے طور پر مسلط کیا جاتا رہا اور بائیں بازو کے بڑے پیمانے پر نظریاتی انحراف اور نا اہلیت کی صورتحال میں مزدور تحریک پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ پہلے پہل تو تاریخ کے خاتمے کا اعلان کر کے انسانی سوچ کے ارتقا کا تمسخر اڑایا گیا اور پھر طبقاتی شعور کے ممکنہ ابھار کو کند کرنے کے لیے ''تہذیبوں کے تصادم'' جیسے بیہودہ نظریات کو مسلط کر کے پھر انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے جنگوں اور بربریت کا ایک خونی کھلواڑ شروع کر دیا گیا۔ یہ سب اس لیے کیا جا رہا تھا تاکہ ایک زائد المعیاد نظام پر براجمان امریکی سامراج کی اطاعت اور فرمانبرداری کو ہر صورت میں ناگزیر قرار دیا جا سکے اور مصنوعی طور پر عالمی معیشت پر ڈالر کی آمریت کو برقرار رکھا جا سکے۔غرضیکہ معیشت، سیاست، اخلاقیات اور اقدار کے ساتھ ساتھ انسانی شعور، فلسفے اور فکر کی بھی ڈالرائزیشن کی جاتی رہی۔

مگر اب یہ سارا کھیل اپنے منطقی انت کی طرف بڑھ رہا ہے۔گونگے بولنا شروع ہو گئے ہیں۔ پتھر دھڑکنا شروع ہو گئے ہیں۔ دماغوں نے ماحول کو ٹٹولنا شروع کر دیا ہے۔ ہر طرف ایک تلاش ہے، جستجو ہے، پیاس ہے۔ چہرے کندن کی طرح چمک رہے ہیں ۔آنکھوں سے لے کر زبانوں تک سب پر سوالات ہی سوالات منڈلا رہے ہیں۔ ہر کوئی اپنے وجود سے لے کر مستقبل تک سب کچھ پوچھنا اور جاننا چاہتا ہے۔ جواب کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ یہ ساری صورتحال بحیثیتِ مجموعی سیاسی افق پر ایک نظریاتی تصادم کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔لوگ دوبارہ سوشلزم کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ میں بھی۔ جہاں سوشلزم اور انقلاب کے الفاظ بھی اتنے قابلِ نفرت تھے جیسے کہ یہ کوئی گالی ہوں۔ حال ہی میں امریکہ میں کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق 30 سال سے کم عمر کے لوگوں میں 53 فیصد سوشلزم کو ایک بہتر نظام تصور کرتے ہیں اسی طرح جمہوریت کی حمایت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ گویا نوجوان نسل نے سٹالنزم کے جرائم کی وجہ سے سوشلزم کے خلاف کیے جانے والے پراپیگنڈے کو مسترد کرنا شروع کر دیا ہے ۔سیاہ فام امریکیوں میں سوشلزم کی حمایت اور بھی زیادہ ہے۔کسی لیبر یا سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی عدم موجودگی بیک وقت مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثرات مرتب کرے گی۔

منفی یہ کہ اس امریکی نوجوان نسل کے پاس لڑنے کے لیے کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں ہوگا اس لیے تحریک میں فرسٹریشن اور بے یقینی غالب آسکتی ہے مگر مثبت یہ کہ ایک طویل تگ ودو اور پے در پے شکستوں کے تھپیڑوں کے بعد جب وہ ایک نئی سیاسی قوت یا لیبر پارٹی کو تخلیق کریں گے تو سٹالنسٹ نظریات کی میکانکیت ان کے رستے کی رکاوٹ کے طور پر موجود نہیں ہوگی۔ یہ بھی تاریخ کی کفایت شعاری کا بہترین نمونہ ہے۔ بہت سے بوژوا مبصرین بھی عالمی پیمانے پر اس طبقاتی اور نظریاتی جنگ کی پیش بینی کر رہے ہیں۔

اکانومسٹ کے ایڈیٹر ان چیف جان مائیکل تھویٹ اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں کہ ”آنے والے سال میں دنیا کا کاروبار چلانے والے لوگ تبدیل ہو جائیں گے اور نظریات بھی بدل سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بہت کچھ ہو سکتا ہے اور اگر نظریات کی جنگ کو پیشِ نظر رکھیں تو اس سے بھی زیادہ۔ 1990ء کی دہائی میں جب سوویت یونین گرا تو تاریخ کے خاتمے اور مغربی معاشی و سیاسی آزاد خیالی کی بات کرنا ایک فیشن بن گیا۔ لیکن پچھلا عشرہ دی اکانومسٹ جیسے ان حلقوں کے لیے جو زیادہ آزاد اور کھلی دنیا کے خواہشمند ہیں، زیادہ مشکل رہا ہے۔ 11 ستمبر 2001ء کی خونریزی نے سب کو دہلا دیا پھر بعد میں مغرب کے مالی بحران نے لبرل سرمایہ داری کی قدر و قیمت کے بارے میں شبہات کو ابھارا۔ 2012ء میں ہر قسم کے نظریات کا تصادم مزید نمایاں ہو جائے گا۔ مغرب میں جب مالی خسارے کم کرنے کے لیے سخت فیصلے کرنے ہوں گے تو حقیقی سیاست کی بھرپور واپسی ہوگی۔ آنے والے انتخابات میں 'نمو کے فوائد میں شریک' ہونے کے بجائے دکھوں کو بانٹنے کا حوالہ دیا جائے گا۔ بعض انتہائی نوعیت کے موقف ابھی سے واضح ہو رہے ہیں۔ مثلاً امریکہ کے ریپبلیکنز نئے ٹیکسوں کو مسترد کر دیں گے۔ بایاں بازو بینکاروں پر حملہ آور ہوگا اور دایاں بازو دفتر شاہی پر۔ عسکریت پسندی، تعصب اور تحفظ پسندی اب بھی کئی سیاست دانوں کی پناہ گاہ رہے گی۔ لیکن مغرب میں نظریات کی جنگ نے اگر خونخوار شکل اختیار کی تو ممکن ہے 2011ء میں لندن اور ایتھنز کی سڑکوں پر ہونے والے واقعات اور فسادات مستقبل میں بھی جاری رہیں۔“

یہ نظریاتی مباحثے آنے والے دنوں میں محض کسی میگزین کے اوراق تک محدود نہیں

رہیں گے بلکہ یونیورسٹیوں، کالجوں، ہاسٹلوں، چائے خانوں، بسوں، ورکشاپوں اور حتیٰ کہ کھیتوں، کھلیانوں، فیکٹریوں اور کارخانوں تک پہنچ جائیں گے۔ان مباحثوں کا یہ سفراب نسلوں، جنموں، صدیوں اور عشروں پر محیط نہیں ہوگا بلکہ یہ سب کچھ آنے والے برسوں میں ہوگا۔اور اس سے مارکسیوں کو نیا حوصلہ اور شکتی ملے گی جس سے وہ مارکسزم کے عظیم نظریات اس نئی تازہ دم نسل تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے اور اگر اس کیفیت میں آنے والے برسوں یا عشروں میں دنیا کے کسی بھی ایک ملک میں وہ سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو نظریات کی متلاشی یہ پوری نوجوان نسل ان کی اس للکار پر لبیک کہتی ہوئی باہر نکل آئے گی اور بلاشبہ یہ انسانی تاریخ کی خوش قسمت ترین نسل ثابت ہوگی جوان سب عظیم واقعات کو نہ صرف دیکھ رہی ہوگی بلکہ براہِ راست ان میں مداخلت بھی کر رہی ہوگی۔

پاکستان کے ان شاونسٹ اور بے عملے انقلابیوں کی سوچوں کے برعکس جو یہاں کے محنت کش طبقے کو گالیاں دے کر اور نا اہل جاہل کہہ کر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نظریاتی بحثیں بہت جلد پاکستانی سماج میں بھی داخل ہوں گی اور کالجوں سے لے کر فیکٹریوں تک میں بڑے پیمانے پر اپنا اظہار کریں گی اور یہاں بھی سماج اور نظام کی مکمل تبدیلی کے بے شمار مواقع پیدا ہوں گے اور مشہور کہاوت ہے کہ ”مواقع تیار شدہ ذہنوں پر ہی مہربان ہوتے ہیں“۔

لیکن پاکستان کے سیاسی تناظر کے حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ امریکی قیادت پر داخلی طور پر عوامی دباؤ جتنا بڑھتا جائے گا، خارجی محاذوں پر اس کے زیادہ متشدد اور خونخوار ہونے کے امکانات بڑھتے رہیں گے۔نئی جنگیں شروع نہ بھی کی جائیں تو پہلے سے جاری جنگوں میں فتح کے امکانات جتنے مسدود ہوتے رہیں گے ان جنگوں کی وسعت اور اشتعال میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ’دہشت گردی کے خلاف جنگ‘ جو اب کافی حد تک افغانستان سے زیادہ پاکستان میں لڑی جا رہی ہے وہ ختم ہونے کی بجائے شدت اختیار کرے گی جس سے پاکستانی ریاست کا بحران کئی گنا بڑھ جائے گا۔اگرچہ امریکی ریاست کے اندر بھی شدید خلفشار بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مختلف ادارے بہت تیزی سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔اور

اوباما کی مذاکرات کی پالیسی کو ناکام بنانے کے لیے مضبوط دھڑے پینٹا گان کے ذریعے وائٹ ہاؤس پر دباؤ بڑھا رہے ہیں اور اسی سال انتخابات بھی قیادت کو مجبور کریں گے کہ وہ اعترافِ شکست کی بجائے زیادہ جارحانہ نعرے بازی کریں۔

اکانومسٹ کے ماحولیات وتوانائی کے ایڈیٹراور سابق نامہ نگار برائے جنوبی ایشیا جیمز آسٹل کے مطابق ''افغانستان میں ایک دہائی سے چلنے والی جنگ نے امریکہ اور پاکستان کو پھر مجبوراً شانہ بشانہ کھڑا کر دیا تھا۔دونوں اپنی ''پُرفریب'' دوستی کو ابھی تک برقرار رکھے ہوئے ہیں۔امریکہ پاکستان کو عالمی امن کے لیے خطرہ، دہشت گردی کا معاون، طالبان کو پناہ دینے والا اور افغانستان میں نیٹو مشن کا دشمن تصور کرتا ہے۔ پھر بھی وہ اسے اتحادی کہتا ہے۔ پاکستان نے امریکی امداد جیب میں ڈال کر ملک کے اندر موجود اسلامی شدت پسندوں کے خلاف موثر لڑائی لڑی لیکن طالبان کو نوازنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ سلسلہ یوں نہیں چل سکتا اور 2012ء میں دونوں ملکوں کے مابین سخت کشیدگی پیدا ہوگی۔ امریکہ پاکستان کو برداشت کر رہا ہے ایک تو بے بسی کی وجہ سے کہ اور کوئی راستہ نہیں اور دوسرے اس امید پر کہ بقول امریکہ پاکستان راہِ راست پر آ جائے گا۔لیکن ایسا نہیں ہوگا۔پاکستان کے جرنیلوں کو یقین ہے کہ صدر حامد کرزئی کی افغان حکومت ان کے مفادات کے خلاف ہے اور اگر نیٹو وہاں سے نکل گیا تو طالبان پھر اقتدار پر قبضہ کر لیں گے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ نیٹو کے بعد افغانستان میں اس کا عمل دخل ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ کم ازکم ملک کے جنوبی علاقوں میں طالبان کے لیے گنجائش نکالنی ہوگی۔''

مگر تاریخ کا عمومی سا مشاہدہ بھی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ حکمران طبقات کے داخلی تضادات کبھی بھی ناقابلِ مصالحت نہیں ہوتے اور جونہی انہیں ایک طبقاتی جنگ کے آثار نظر آنا شروع ہوتے ہیں تو وہ فوراً مصالحت کر کے ایک طبقاتی جڑت کے ذریعے تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی جلد یا بدیر جب ایک انقلابی ابھار کا سامنا ہوگا تو یہاں کے حکمران طبقات فوری طور پر اپنے سامراجی آقاؤں سے مدد کی بھیک مانگیں گے مگر ایسی صورتحال

میں ان غاصبوں کا باہم عملی اشتراک دیکھ کر تحریک مزید مشتعل ہو جائے گی اور اس کو شکست دینے کے لیے پھر دوبارہ خارجی محاذ آرائی کی کوشش کی جائے گی۔ غرضیکہ ہر پہلو سے ایک ہی بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ آنے والے دنوں میں پھر عظیم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ ایسے واقعات جن کے لیے کامریڈ جان ریڈ کے بقول جیا بھی جا سکتا ہے اور مرا بھی جا سکتا ہے۔

عالمی سطح پر ہونے والے واقعات اور ان واقعات پر بورژوا ماہرین کے تبصروں کو دیکھ کر کامریڈ ٹیڈ گرانٹ کو وہ الفاظ پھر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔

’’آنے والی دہائیاں سرمایہ داری کے ٹوٹ کر بکھر جانے کے بعد کئی انقلابات کی گواہی بنیں گی حتیٰ کہ جنگوں (عالمی) کا درمیانی پر تشدد اور پر انتشار دور بھی آنے والے دنوں کے سامنے پرسکون دکھائی دے گا۔ انہی طوفانوں اور آندھیوں (سماجی ابھاروں) کی کوکھ سے عالمی انقلاب کا حقیقی اوزار (انقلابی پارٹی) جنم لے گا۔ کامنٹرن (1917-1923ء) کے عظیم دن دوبارہ تخلیق ہوں گے۔ بالشوازم کی شاندار روایات ماضی کے عظیم ورثہ اور محنت کش طبقے کی شکستوں سے سبق سیکھتے ہوئے مارکسزم کے نظریات کی حمایت عالمی پیمانے پر طوفان بن کر ابھرے گی جو کہ ایک دفعہ پھر کچلے ہوئے طبقات کے ذریعے سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکے گی اور عالمی سوشلسٹ جمہوریہ کی بنیاد بنے گی۔‘‘

ٹیڈ گرانٹ (ان ٹوٹ دھارا)

ناکام ریاست کے ہچکولے

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل ودر میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

اقبال ساجد

قومی ریاست، آج کے عہد میں اس لفظ پر کبھی ہنسی آتی ہے اور کبھی ترس۔ عالمی مالیاتی سرمائے نے اس کا وہ بلادکار کیا ہے کہ یہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ذرائع پیداوار کی ترقی نے جس درجے کی پیداواری صلاحیت کو جنم دیا ہے اور اس پیداواری صلاحیت کو جس پیمانے کی منڈی کی ضرورت ہے اس کے مقابلے میں قومی ریاست کی گنجائش تو ایک صدی قبل ہی جواب دے چکی تھی اور اب پیداواری معیشت پر مالیاتی سرمائے کے فیصلہ کن غلبے نے اس کا حشر نشر کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا اب کردار محض اتنا رہ گیا ہے کہ یہ اپنی حدود اور استطاعت کے مطابق اپنے مسلح جتھوں کے ذریعے مالیاتی سرمائے کے مخصوص دھڑے اور سامراجی مفادات کا دفاع کرے اور یہ بات صرف کمزور، غیر ترقی یافتہ اور نو آبادیاتی ریاستوں کے لیے ہی درست نہیں بلکہ جدید ترقی یافتہ ریاستیں بھی بڑی کمپنیوں اور کارٹیلز کے مفادات سے ٹکرانے کی جرات نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ تاریخ کی سب سے بڑی فوجی اور سامراجی طاقت امریکہ کی ریاست بھی امریکی کمپنیوں کی گماشتگی کرنے پر مجبور ہے۔ حالیہ بحرانات کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ امریکی ریاست اور امریکی کمپنیوں کے مفادات باہم متصادم بھی ہو جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو چیز امریکی کمپنیوں کے مفاد میں ہے وہ امریکی ریاست کے لیے بھی درست ہو۔ یہی صورتحال سارے یورپ اور تمام ترقی یافتہ ریاستوں کی بھی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس سے پہلے محروم طبقات کو اس پر قبضہ کر کے یہاں مزدور ریاست کو قائم کرنا ہوگا اور

پھر بورژوا جونکوں کی اقلیت اور ان کے پیٹی بورژوا گماشتوں کے خلاف اسے اس وقت تک استعمال کرنا ہوگا جب تک ان کی تاریخی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد یہ ریاست رفتہ رفتہ مٹتی مٹتی بالآخر تاریخ کے کوڑے دان میں پہنچ جائے گی۔

جہاں قومی ریاست کی طبعی عمر ختم ہو چکی ہے وہاں مادر پدر آزاد معیشت بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی ہے اور دوبارہ سے تحفظاتی پالیسیوں کی طرف ایک رجحان دکھائی دے رہا ہے۔ خاص طور پر یورپی یونین اور یورو کے شدید ترین بحران کے بعد تو ریاستی سرمایہ داری کی اذانیں بھی دوبارہ گونجنا شروع ہو چکی ہیں۔ دراصل عالمی بورژوازی حالیہ بحران سے نکلنے سے مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے اور اب دوبارہ ریاست کی بیساکھی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ مگر آج کے عہد میں ریاست سے امداد کی بھیک مانگنا کسی اندھے سے روشنی مانگنے کے مترادف ہوگا۔ ریاستوں کے پاس جو جو کچھ تھا وہ پہلے ہی بڑی دیانتداری سے بیل آؤٹ پیکیجز کی شکل میں سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور بینکاروں پر نچھاور کر چکی ہیں۔ ریاستی سرمایہ داری محض ایک یوٹوپیا ہے اور اس کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دھوکہ دہی کے لیے پھر اچھالا جا رہا ہے تاکہ چابکدستی سے محنت کشوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جائے اور پھر جونہی معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو ریاست کو کنڈوم کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا جائے۔ لیکن اب ساری دنیا کا معاشی اور سیاسی معروض شاید اس منصوبے پر عملدرآمد کی اجازت نہیں دے گا۔

پاکستان کا حکمران طبقہ ماضی کے تمام نوآبادیاتی اور پسماندہ ممالک کے حکمران طبقات کی طرح جدید قومی ریاست کے قیام میں بری طرح ناکام ہوا ہے۔ جاگیرداری کے خاتمے، سیکولر ریاست کی تشکیل، فزیکل اور سوشل انفراسٹرکچر کی تعمیر سمیت قومی جمہوری انقلاب کا کوئی ایک فریضہ بھی پورا نہیں کیا جا سکا۔ جس کی وجہ سے مالیاتی اور ٹیکنیکی اعتبار سے یہ حکمران طبقہ پہلے دن سے ہی سامراجی آقاؤں کے سامنے دم ہلانے پر مجبور ہے اور دوسری طرف قدرِ زائد پیدا کرنے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ پہلے دن سے ہی ٹیکس چوری اور بدعنوانی میں ملوث رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ریاستی مشینری کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کرنے کی بجائے ہمیشہ خود اس کو جوابدہ

رہا ہے جس کی وجہ سے معیشت اور سیاست میں ریاستی یعنی فوجی مداخلت ہمیشہ بڑھتی ہی رہی ہے۔ یوں پاکستانی حکمران طبقہ جن دو بنیادی بیساکھیوں کے سہارے چلتا رہا ہے وہ امریکی سامراج اور پاک فوج ہیں۔ ان دونوں کے کردار کا تفصیلی تجزیہ کرنا بے حد ضروری ہے اور اب اس حکمران طبقے کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ دونوں بھی اپنے اپنے بحرانوں اور مفادات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں اور یہ حکمران طبقہ اپنے طبقاتی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں کی صلح کروانے کی مسلسل کوششیں کرتا رہا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ مگر اس قسم کی کشیدگی میں ثالثی کروانے والوں کو سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ رفتہ رفتہ دونوں فریقین کا اعتماد کھو دیتے ہیں۔ آصف علی زرداری کی قیادت میں موجودہ سیاسی سیٹ اپ کی دکھ بھری کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

حال ہی میں میمو کھلواڑ پر شور مچانے والے نام نہاد قومی شاونسٹ سیاستدان شاید تاریخ سے بالکل ہی نابلد ہیں۔ اس ملک کی تو ساری تاریخ ہی اس قسم کی یادداشتوں اور کاسہ لیسیوں سے بھری پڑی ہے۔ سب سے پہلی یادداشت یا التماس تو خود پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے امریکی آقاؤں کے حضور پیش کی تھی جب وہ ملک کے قیام کے اگلے سال ہی کاسہ لے کر وہاں بھیک مانگنے پہنچ گئے تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ حکمران طبقہ امریکہ کی بے لوث غلامی کرتا چلا آ رہا ہے۔ مگر آج یہ آقا اور غلام کا باہمی تعلق بھی شدید تناؤ اور دباؤ کا شکار ہو چکا ہے۔

اس وقت اور آج کے حالات میں فرق یہ نہیں ہے کہ پاکستان کا بانی حکمران طبقہ بہت زیادہ بے غیرت تھا اور آج کا حکمران طبقہ بہت باضمیر اور خود دار ہو گیا ہے بلکہ دونوں صورتوں میں بنیادی فرق عہد کے کردار کا ہے۔ اس وقت دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ ایک ابھرتی ہوئی سامراجی قوت تھا اور اب بظاہر ایک ڈوبتی ہوئی کشتی معلوم ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اب اس کی مالیاتی حیثیت وہ نہیں رہی جس کے ذریعے یہ اپنی اس گماشتہ ریاست کی اتنی بھی مالیاتی اور ٹیکنیکی معاونت کر سکے جس کے ذریعے ان حکمرانوں کی لوٹ مار کی ہوس کی ہی تکمیل ہوتی رہے۔ جس کی وجہ سے پاک امریکہ تعلقات ٹھیک ہونے کی بجائے مسلسل بگڑتے جا رہے ہیں۔ پاکستان کے حکمران

طبقات کے ایک دھڑے کو خدشہ ہے کہ شاید امریکہ اب ان کی درکار خیراتی ضروریات کو پورا کرنے کی پوزیشن میں کبھی نہیں آسکے گا اور یہ بات کافی حد تک درست بھی معلوم ہوتی ہے۔

امریکی معیشت کے لیے دی اکانومسٹ کے ایڈیٹر گریگ اپ کا کہنا ہے کہ ''ویسے تو امریکی سیاستدان معیشت کو خود ہی ڈبونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وفاق کی طرف سے دی جانے والی عارضی مالی امداد کی مدت ختم ہو رہی ہے۔ ریاستی اور مقامی حکومتوں میں ملازمتوں میں جو کٹوتیاں کی گئی ہیں ان سے بیروزگاری کی مجموعی شرح میں کم و بیش 0.4 فیصد تقابلی پوائنٹس کا اضافہ ہوا ہے۔ 2011ء کے اختتام پر تنخواہوں پر ٹیکس میں کمی اور بیروزگاری انشورنس سے ملنے والے فیاضیانہ فوائد ختم ہونے کے بعد 2012ء میں مالی سختیوں میں اضافے کیے جانا طے ہے اور پچھلے بجٹ کے تحت وفاقی اخراجات میں کٹوتیوں کا عمل بھی شروع ہو جائے گا۔ ان سب کی وجہ سے مجموعی داخلی پیداوار میں 2 فیصد تک کمی ہو سکتی ہے۔ جو معاشی ترقی کی شرح کو صفر یا اس سے بھی نیچے لانے کے لیے کافی ہوگی۔''

یوں پاکستانی ریاست کے تناظر کا سارا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ امریکہ کے ساتھ اس کے تعلقات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ دونوں طرف سے تعلقات میں بہتری کی شدید خواہش اور ضرورت کے باوجود قوی امکان یہی ہے کہ تعلقات میں کشیدگی نہ صرف یہ کہ برقرار رہے گی بلکہ بڑھتی بھی رہے گی۔ دونوں طرف سے ریاست کا اشتعال اور حکمران طبقے کی بوکھلاہٹ اور بے صبری حالتِ جنگ کو زیادہ مادی حقیقی بنیادیں فراہم کر سکتے ہیں کیونکہ حالتِ جنگ کو لمبے عرصے تک مصنوعی طریقوں سے برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کو طول دینے کی کوششیں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک حقیقی جنگ کو ان دونوں پر مسلط کر سکتی ہیں اور عملاً آج بھی ایک جنگ چل رہی ہے جو بظاہر امریکہ کی غیر ریاستی عناصر کے خلاف جنگ ہے۔ لیکن پاکستانی حکمرانوں اور سیاستدانوں کی طرف سے امریکہ کے خلاف شدید ترین نعرے بازی کے باوجود شمالی علاقوں اور ایجنسیوں میں روزانہ ڈرون حملے جاری ہیں جس میں بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہو رہا ہے۔

روزنامہ جنگ کی ایک رپورٹ کے مطابق ''2011ء میں وزیرستان اور کرم ایجنسی پر 78

ڈرون حملے ہوئے جن میں 607 افراد جاں بحق اور 120 سے زائد زخمی بھی ہوئے۔ دسمبر میں مخصوص سیاسی ماحول کی وجہ سے کوئی ڈرون حملہ نہیں ہوا۔ جبکہ اس سے قبل 2010ء میں قبائلی علاقوں پر 124 ڈرون حملوں میں 1184 افراد جاں بحق ہوئے تھے۔''

امریکی دعوؤں کے برعکس مارے جانے والوں کی اکثریت دہشت گرد یا شدت پسند نہیں بلکہ غریب اور معصوم لوگوں پر مشتمل ہے جو پہلے ہی بھوک اور محرومی کی چکی میں پس رہے ہیں اور آج کے ترقی یافتہ عہد میں ہزاروں سال پرانی تہذیب اور حالاتِ زندگی میں رہنے پر مجبور ہیں اور ان حالات میں بہتری آنے کی بجائے دن بدن گراوٹ ہی ہوتی جا رہی ہے۔ غرضیکہ نام نہاد امن کا دور ہو یا بدمست جنگی جنون دونوں صورتوں میں محنت کش عوام کی زندگیاں بدتر سے بدترین ہوتی چلی جا رہی ہیں اور اب اس جنگی جنون کے علاوہ اس نظام کے پاس کوئی دوسرا راستہ بچا بھی تو نہیں۔

لاہور یونیورسٹی آف مینیجمنٹ سائنسز کے وائس چانسلر عادل نجم پاک امریکہ تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''2012 امریکہ میں انتخابات کا سال ہے۔ پاکستان امریکہ کے ان چند مسائل میں سے ایک ہے جس کے حوالے سے تمام انتخابی امیدواروں میں اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔ ایسے میں اصل مقابلہ اس بات پر ہو گا کہ کون سا امیدوار پاکستان کے خلاف 'سخت ترین' رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس لیے 2012ء میں نہایت کڑوی اور زہریلی باتیں سننے کے لیے خود کو تیار کر لینا چاہیے۔ انتخابی مہم میں کی جانے والی تقاریر ایک ایسے وقت میں پاکستان سے 'ڈو مور' کا مطالبہ کریں گی کہ جب مزید کچھ کرنے کی پاکستان کی صلاحیت انتہائی نچلی سطح پر آ چکی ہو گی اور خود امریکہ کی پاکستان کو مزید کچھ دینے کی خواہش اس سے بھی زیادہ نچلی سطح پر ہو گی۔ چنانچہ 2012ء کسی بھی طور پاک امریکہ تعلقات میں بہتری کی نوید نہیں دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی انتخابات میں 'پاکستانی کارڈ' کی اتنی اہمیت نہیں ہو گی جتنی پاکستانی انتخابات میں 'امریکی کارڈ' کی اور یہی انتخابی طرزِ فکر دونوں کے تعلقات میں سب سے زیادہ خلل انگیز ثابت ہو گا۔ ایسے وقتوں میں امریکہ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنانا پاکستان میں پسندیدہ مشغلہ ہے اور 2012ء میں یہ شغل ایک

جنون کی شکل اختیار کرلے گا۔''

اگر پاکستانی فوج کا ایک اکائی کے طور پر تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید کوئی بھی نتیجہ نہ نکل سکے کیونکہ اب یہ فوج ایک مربوط اور منظّم اتحاد ہونے سے زیادہ مختلف گروہی مفادات کا ایسا اکٹھ بن چکا ہے جو ایک دوسرے کو برداشت بھی نہیں کر سکتے اور ادارے کی ساکھ اور تسلط کو بحال کرنے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرنے پر بھی مجبور ہیں۔ مالیاتی سرمائے کی دیمک نے فوج کو اندر سے کھوکھلا اور چڑچڑا کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ فوج اور آئی ایس آئی کے کچھ ریٹائرڈ جرنیلوں کے اثر ورسوخ نے بھی فوج کے ڈھانچے میں دراڑوں کو شدید کیا ہے۔ ملٹری کمانڈ مرکز مائل اور مرکز گریز دھڑوں کے درمیان مشروط قسم کے معاہدے کروا کر خود اپنے کنٹرول کو مصنوعی طریقے سے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ فوج میں دو زیادہ مضبوط اور بڑے نمایاں دھڑے امریکہ نواز اور نام نہاد طالبان نواز دھڑے ہیں۔ طالبان نواز مذہبی دھڑے کی سرپرستی زیادہ تر آئی ایس آئی کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ جرنیلوں کے پاس ہے۔ آئی ایس آئی کا ایک اپنا ماضی اور تاریخ ہے۔

آئی ایس آئی کا قیام تو پاکستان کے قیام کے فوری بعد ہی عمل میں آ گیا تھا مگر اس کے بعد یہاں ابھرنے والی تحریکوں کو شکست دینے کے لیے اس حکمران طبقے اور ریاست نے اور ساتھ ہی سرد جنگ کے دنوں میں اس خطے میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے امریکی سامراج نے اس کے دفاعی، سیاسی، داخلی اور خارجی کردار میں بڑے پیمانے پر اضافہ کیا تھا اور اس کے اس کردار کو بخوبی نبھانے کے لیے نہ صرف ملکی معیشت کے بڑے شعبوں تک اس کو رسائی دی گئی بلکہ اس کے لیے ایک متوازی غیر دستاویزی معیشت کو بھی پروان چڑھایا گیا اور یہ عمل افغان جنگ کے دنوں میں اپنی انتہاؤں کو پہنچ گیا۔ اس سارے عمل کے دوران آئی ایس آئی کو اپنی معاشی مداخلت کے ذریعے اپنا سیاسی نیٹ ورک تشکیل دینے کے آسان مواقع میسر آتے رہے۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان میں تحریک کو کچلنے کے لیے اور بعد میں افغان جنگ کے لیے عوامی رائے عامہ کی تشکیل کے لیے یہ سارا عمل سامراجیوں اور حکمران طبقے دونوں کے مفاد میں تھا۔ مشرقی پاکستان میں الشّمس اور البدر کے نام پر ردِ انقلابی قوتوں نے آئی ایس آئی کے ایما پر جو گل کھلائے اس کا ثبوت تو یہ ہے کہ

آج بھی بنگلہ دیش میں ان پر جنگی مقدمات چلائے جا رہے ہیں اور یوں اس سیاسی نیٹ ورک اور کالے دھن کے ذریعے آئی ایس آئی حکومتیں بنانے اور گرانے کی صلاحیت حاصل کر گئی اور حتیٰ کہ تمام سویلین امور براہِ راست کنٹرول کرنا شروع کر دیئے اور جب امریکہ کے ساتھ ان کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوا تو نہ صرف فوج بلکہ ساری سیاسی اور مذہبی قیادت ہی اس سارے کھلواڑ میں ملوث ہوگئی۔لیکن آئی ایس آئی کے اس معاشی نیٹ ورک کا دائرہ کار لامحدود نہیں ہے۔اس لیے رفتہ رفتہ معاشی بے یقینی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے آئی ایس آئی کے اندر بھی مختلف تضادات جنم لینا شروع ہوگئے اور وفاداریاں خریدنے اور بیچنے کا عمل پوری شدومد سے جاری وساری ہے۔

ندیم ایف پراچہ 15 جنوری 2012ء کے ڈان میں پاک فوج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''پاکستانی فوج ایک ادارے کے طور پر ایک متجسس مخلوق ہے۔ایک ایسا خودغرض اور مفاد پرست بھاری ہاتھی جسے جب بھی معاشی اور سیاسی گنجائش نظر آتی ہے کہ یہ اپنی حدود و قیود سے تجاوز کر سکے تو یہ ایسے ہی وارد ہوتا ہے جیسے کوئی بیل کسی دکان میں گھس کر سب کچھ تہس نہس کر دے۔اگرچہ اس نے اپنے روایتی دشمن (بھارت) کے خلاف ساری جنگیں ہاری ہیں مگر اس نے اپنے ان عوام کے خلاف کافی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے جن کی حفاظت کی یہ دعویدار ہے۔ایک قابلِ انحصار اور موثر لڑاکا مشین ہونے سے بڑھ کر اب پاکستانی فوج ایک ٹھوس مربوط کارپوریٹ اور ایک سیاسی عنانیت کی شکل اختیار کر چکی ہے جس نے ایک جعلی مفروضے یعنی 'نظریہ پاکستان' کے نام پر ہمیشہ بڑی حد تک اپنے معاشی مفادات اور سماجی بنیادوں کا دفاع کیا ہے۔اور ہمیشہ سویلین سیاسی معاملات میں بے جا مداخلت کی ہے اور ایسا کرنے کے لیے اس نے ایوب خان کی فوجی حکومت سے لے کر اب تک مجرد نظریات کی حامل رجعتی قوتوں، جیسا کہ مذہبی سیاسی پارٹیوں، میڈیا کے دائیں بازو کے دھڑوں، قدامت پسند سیاستدانوں، بہت سارے ٹیکنوکریٹس، سرمایہ داروں اور بیوروکریٹوں کی بھرپور حمایت حاصل کر لی ہے جن کے اپنے مفادات اب فوج کے ساتھ ناقابلِ علیحدگی ہو چکے ہیں۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نام نہاد نظریہ پاکستان کی حفاظت کا اصل مطلب فوج، مذہبی پارٹیوں، سرمایہ داروں اور ان کے حامیوں کے معاشی اور سیاسی مفادات

کوممکنہ انتشار سے محفوظ رکھنا ہے۔''

مشرف حکومت تک تو عسکری قیادت ان دونوں متحارب فریقین کے درمیان معاملات طے کرانے کی کوشش میں ڈبل گیم کرتی رہی مگر اس سے ملٹری انٹیلی جنس اور آئی ایس آئی کے درمیان تصادم نے سماج کا رخ کر لیا اور خودکش حملوں اور بم دھماکوں سے سارا سماج بھڑکتے ہوئے جہنم میں تبدیل ہوگیا۔ مگر گزشتہ چار برسوں میں امریکہ کی فوجی، سیاسی اور معاشی اتھارٹی کمزور ہونے کی وجہ سے پاک فوج کے امریکہ نواز دھڑے کو نسبتاً پسپائی اختیار کرنی پڑی ہے جس کی وجہ سے سارا دباؤ امریکہ نواز پیپلز پارٹی کی حکومت کی طرف شفٹ ہوگیا ہے۔ یوں پاکستان کا ریاستی اور سیاسی خلفشار بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ امریکیوں کی کمزور پوزیشن کی وجہ سے خطے کی دیگر طاقتوں کی بھی پاکستان کے ریاستی معاملات میں مداخلت کئی گنا بڑھ گئی ہے خاص طور پر فوج کے چین نواز دھڑے نے فوج کے اندر داخلی تناؤ کو شدید ترین کر دیا ہے اور یہ تناؤ آنے والے دنوں میں سارے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے کر خانہ جنگی کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

اسی طرح سعودی عرب اور ایران کی حمایت اور معاونت کی بنیاد پر تفریق صرف مذہبی اور فرقہ وارانہ پارٹیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ بھی ریاستی اداروں کے اندر تک سرائیت کر گئی ہے۔ بلکہ فرقہ پرور پارٹیوں کا اشتعال تو محض اس ریاستی اداروں کے اندران کی حمایت یا برتری کا عکس ہی ہوتا ہے۔ سعودی عرب اور ایران کے مابین مصنوعی محاذ آرائی بھی یہاں حقیقی خونریزی کا باعث بن جاتی ہے۔ جس میں معصوم اور نہتے خواتین وحضرات اور ننھے بچوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ حال ہی میں ان دونوں علاقائی قوتوں کے مابین کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا ہے جو آنے والے دنوں میں مزید بڑھے گا جس کے پاکستانی ریاست پر انتہائی گھناؤنے اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن اس سارے کھیل میں فوج بری طرح بے نقاب ہوئی ہے اور دوبارہ وہ مورال حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے جس کے ذریعے پھر سیاسی اور ملکی معاملات کو براہِ راست کنٹرول کیا جا سکے۔ فوج کی اس داخلی کمزوری کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے اقتدار کو طوالت مل رہی ہے جسے چند خوش

فہم اور کم شناس لوگ پیپلز پارٹی کی قیادت کی ذہانت اور فہم و فراست قرار دے رہے ہیں۔ کمزور پوزیشن کی وجہ سے فوج ریاست کے دیگر اداروں کو بھی اس طاقت کے کھلواڑ میں گھسیٹ لائی ہے کیونکہ یہ فوجی بغاوت کرنے کی معاشی اور سماجی استعداد سے عاری ہو چکی ہے۔ کسی بھی فوج پر اس سے زیادہ برا وقت کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی قیادت کو اپنی پوزیشن بچانے کے لیے عدالت سے رجوع کرنا پڑ جائے اور عملاً صورتحال یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے اندر ایک درخواست دائر کی گئی ہے جس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ صدرِ پاکستان آصف علی زرداری اور وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی کو باز رکھا جائے کہ وہ ڈی جی آئی ایس آئی شجاع پاشا اور چیف آف آرمی سٹاف اشفاق پرویز کیانی کو ان کے عہدوں سے برخاست نہ کریں۔ یعنی درحقیقت عسکری قیادت اس وقت عدالتی سٹے آرڈر کے ذریعے چل رہی ہے۔

اکانومسٹ اپنی حالیہ اشاعت میں لکھتا ہے کہ ''تاہم فوج جسے شمال مغرب میں ایک مذہبی بغاوت کا سامنا ہے، ایسی کیفیت میں انتہائی خستہ حال بیمار معیشت کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتی اور اسے اچھی طرح یاد ہے کہ مشرف کے آٹھ سالہ اقتدار کے اختتام پر فوج کس حد تک غیر مقبول ہو چکی تھی۔ مزید برآں 'عرب بہار' کے بعد پاکستان میں ایک ناپسندیدہ فوجی بغاوت کے نتائج بھیانک ہو سکتے تھے اور ابھی اس بات کے بھی امکانات مبہم ہیں کہ آئینی طریقے سے کیسے ایک ایسی ٹیکنوکریٹ نگراں حکومت کو اقتدار منتقل کیا جائے جو فوجی حاکمیت کو ایک سویلین شباہت دے سکے۔ پس اسی لیے فوج نے حسبِ معمول پلان B (نرم اور آہستہ بغاوت) کی طرف رجوع کیا۔ اس امید پر کہ کسی طرح عدالتیں پیپلز پارٹی کی حکومت کو اقتدار سے باہر دھکیل دیں اور ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے جو فوج کی زیادہ مطیع اور فرمانبردار ہو۔''

عدلیہ جس کی دو سال قبل سماج میں بالخصوص مڈل کلاس میں مقبولیت میں اضافہ ہوا تھا اب اس مقبولیت کا گراف بھی تیزی سے نیچے آنا شروع ہو گیا ہے اور عدلیہ کی جانبداریت کا پول کھلتا جا رہا ہے۔ عوامی حلقے تو درکنار خود سپریم کورٹ بار کے انتخابات میں بھی افتخار چوہدری کے مریدین کو دو بار شکست کا سامنا کرنا پڑ چکا ہے اور اس کے درپردہ اصل عزائم اب کافی حد تک بے نقاب ہو

چکے ہیں۔اب عوامی سطح پر بحث ومباحثوں میں یہ بات بار بار دہرائی جانے لگی ہے کہ عدلیہ اصولی طور پر کرپشن کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ موجودہ حکمرانوں کی کرپشن کے خلاف ہے۔اب تک سپریم کورٹ کی طرف سے کوئی ایک فیصلہ بھی ایسا نہیں آیا جس کا نقصان نواز شریف کو اٹھانا پڑا ہو ۔بلکہ سپریم کورٹ نے حالیہ دنوں میں نیب کیس میں یہ احکامات صادر فرمائے ہیں کہ نواز شریف کی ضبط شدہ جائیداد فوری طور پر اسے واپس کی جائے۔فوج اور آئی ایس آئی کے سربراہان کے پہلی دفعہ پارلیمنٹ میں جواب دہی اور نسبتاً کمزور ہونے پر جو لوگ بغلیں بجا رہے ہیں اور اسے جمہوریت کی مضبوطی اور اداروں کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں انہیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خود سپریم کورٹ کا حد سے بڑھا ہوا کردار بھی پاکستانی حکمران طبقات کی قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل میں مکمل نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عدلیہ کی یہ تجاوزات جہاں فوج کے اقتدار کا ہی تسلسل ہیں وہاں یہ ریاست کا شیرزاہ منتشر ہونے سے بچانے کی ایک کوشش بھی ہے۔کیونکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا تشخص بطور ایک ناکام ریاست کے ابھر رہا ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق **2011**ء کی ناکام ریاستوں کی فہرست میں روانڈا، ایتھوپیا، برونڈی اور برما جیسی ریاستوں کو بھی پاکستان سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح ملک کے اندر بھی ریاست اور اس کے اداروں پر سے اعتماد مکمل طور پر اٹھ گیا ہے اور لوگ ریاست کا اصلی چہرہ پہچاننے لگے ہیں اور دوسری طرف خود ملکی اور بیرونی سرمایہ کاروں کا بھی اعتماد ڈانواڈول ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے اور سرمایہ کاری تیزی سے ملک سے باہر رخ کر رہی ہے۔۔ایسی کیفیت میں عدلیہ کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ عوام کا اداروں پر سے کھویا ہوا اعتماد بحال کروائیں۔یعنی دوسرے معنوں میں اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ عوام تمام اداروں سے مایوس ہو کر اپنی تقدیر کے فیصلے خود نہ کرنا شروع کر دیں۔گویا عدلیہ جو بظاہر عوام کے حقوق کی علمبردار بن رہی ہے وہ فیصلہ سازی میں عوام کے کردار کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے تا کہ جمہوریت کے نام پر ایک مٹھی بھر اقلیت کسی بھی قسم کی مداخلت کے بغیر پوری جانفشانی سے ان کا استحصال کر سکے۔کراچی میں بھی جب تک معصوم شہریوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی تو کسی

کے کان پر جوں تک نہیں رینگی مگر جب امن وامان کے مسئلے سے سرمایہ داروں کی نیندیں حرام ہونا شروع ہوئیں تو فوراً سپریم کورٹ نے مداخلت کر کے امن بحال کروانے کی کوشش کی تھی اور چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے یہ ریمارکس دیئے تھے کہ کراچی میں حکومت ناکام ہوئی ہے ریاست ناکام نہیں ہوئی۔ابھی حال ہی میں خرم رسول کیس میں بھی چیف جسٹس نے یہ استفسار کیا ہے کہ ریاست کی ساکھ اور وقار کو مجروح کرنے کی کوئی بھی کوشش برداشت نہیں کی جائے گی۔

ملکی پالیسی سازوں کی حسِ مزاح بھی لائقِ تحسین ہے۔نام نہاد ریاستی خودمختاری کی قبر پر ناکام حسرتوں اور خواہشوں کا محل تعمیر کر کے آزاد عدلیہ کا بورڈ لگا دینے سے زیادہ سنجیدہ مذاق اور کیا ہوسکتا ہے۔عدلیہ کی اس عظیم آزادی سے عوام کا تو غربت، بجلی اور روزگار تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا لیکن ججوں کی تنخواہوں اور مراعات میں بڑے پیمانے پر اضافہ ضرور ہوا ہے اور عدلیہ کی کرپشن کے خلاف شور مچانے سے کرپشن بھی کم نہیں ہوئی بلکہ کئی گنا بڑھ گئی ہے۔خود عدلیہ کے اندر بدعنوانی اور بے ایمانی میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق بدعنوانی میں عدلیہ پہلے چھٹے نمبر پر تھی اور اب ترقی کر کے چوتھے نمبر پر آ گئی ہے۔اسی طرح پاک فوج بھی ایک پوائنٹ کی ترقی سے اب آٹھویں نمبر پر ہے۔دراصل یہ ریاست اور اس کے تمام ادارے سر سے لے کر پاؤں تک لوٹ مار میں ملوث ہیں اور یہ لوٹ مار عوام کے خون پسینے اور محرومی ولاچاری کے شدید ترین استحصال سے لتھڑی ہوئی ہے۔

اگر عدلیہ کی لوٹ مار بڑھ رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنے والے دنوں میں اس لوٹ مار پر حصوں کی لڑائی بھی شدت اختیار کرے گی اور فوج اور دیگر اداروں کی مداخلت سے یہ ایک بھیانک شکل بھی اختیار کر سکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ آج کے ہیرو کل کے زیرو بن جائیں اور خود عدلیہ کے اندر ادارے پر ایک فرد یا ٹولے کی اجارہ داری کے خلاف مزاحمت کی ضرورت کی خبریں گردش کرنے لگیں۔

اس صورتحال میں ابھی تک تو فوج اور عدلیہ ایک ہی سمت میں کھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں مگر آنے والے دنوں میں اگر اداروں کے مابین طاقت کی رسہ کشی اور کشیدگی برقرار رہتی ہے تو اس

کے بالکل الٹ نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔فوج عدلیہ پر اپنا دباؤ اور بھی زیادہ بڑھانے کی کوشش کرے گی اور وقت آنے پر اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ آئینی طور پر فوج کو قومی سلامتی کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر ملکی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دے۔مگر اس دباؤ سے عدلیہ کی رہی سہی ساکھ بھی متاثر ہونے کا اندیشہ سر اٹھا سکتا ہے۔جس کی وجہ سے عدلیہ کے اندر بھی دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔یوں حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ حکمران طبقہ اور اسٹیبلشمنٹ اس ریاست کی ساکھ اور وقار کو بچانے کی جتنی بھی کوششیں کریں گے اس سے اس کا کردار اور بھی زیادہ بے نقاب ہوتا چلا جائے گا اور آبادی کی اکثریت اپنے تجربات سے یہ نتائج برآمد کرنے پر مجبور ہوگی کہ یہ ریاست دراصل چند گنتی کے بدعنوان اور ہوس پرست سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جبر کا آلہ ہے جس کے ذریعے ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور وہ بالآخر ایک بغاوت کے ذریعے اس کو اکھاڑ پھینکیں گے اور ایک مزدور ریاست قائم کریں گے۔

گزشتہ عرصے میں ریاست کے ایک اہم ستون کے طور پر میڈیا کا کردار بہت زیادہ وسعت اختیار کر گیا ہے۔لیکن چونکہ یہ ریاست عوام سے لاتعلق ہو کر ہوا میں معلق ہو چکی ہے اس لیے میڈیا پر بھی عام طور پر نان ایشوز اور ایسی بحثیں دیکھنے میں ملتی ہیں جن کا عوام کی زندگیوں سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔حتیٰ کہ ایسے سیاستدان اور مبصرین جن کی کوئی سماجی بنیادیں نہیں ہوتیں لیکن وہ اپنے مخصوص بے جھجک انداز کی وجہ سے زیادہ سامعین اور ناظرین کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں ان کو میڈیا ٹاک شوز کے ذریعے عوامی شعور پر بہت زیادہ مسلط کیا جاتا ہے۔شیخ رشید اس کی بہترین مثال ہے۔جو شاید ٹاک شوز میں سب سے زیادہ نظر آنے والا سیاست دان ہے جو درحقیقت جی ایچ کیو کا سب سے زیادہ با اعتماد ترجمان ہے۔عمومی طور پر میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا ریاست کے مختلف دھڑوں کی لڑائی میں ایک اکھاڑے کی شکل اختیار کر گیا ہے اور وقتی طور پر دیگر اداروں کے کمزور پڑ جانے کی وجہ سے امریکیوں نے بھی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اپنے مفادات اور پالیسی کو عوامی رائے عامہ پر مسلط کرنے کی کوششیں تیز کر دی ہیں۔

اس وجہ سے عوام نے میڈیا کو خود اس کے بنیادی کردار یعنی رائے عامہ کی تشکیل کے حوالے

سے بھی غیر سنجیدہ لینا شروع کر دیا ہے۔عوام اب ان مبصرین اور ناقدین کے تبصروں سے زیادہ جن میں یکسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تھیٹر اداکاروں کے تمسخر بھرے قہقہوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اب تباہ حال تھیٹر کے کسمپرسی میں رہنے والے اور بیروزگار فنکاروں کے لیے الیکٹرانک میڈیا اپنا فن فروخت کرنے کے لیے ایک مناسب منڈی کے طور پر ابھار رہا ہے۔میڈیا جو جعلی متبادل مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سے مڈل کلاس کی کچھ پرتوں میں تھوڑی بہت ہلچل ضرور ہوتی ہے لیکن عوام کی وسیع تر پرتیں اسے نظرانداز کر دیتی ہیں۔حال ہی میں عمران خان والے پتلی تماشے کو کافی اہمیت ملی ہے مگر اس کا تفصیلی ذکر ہم کسی اور باب میں کریں گے۔

کارپوریٹ میڈیا نہ صرف حکمران طبقات کے بحیثیتِ مجموعی مفادات کا نگہبان ہوتا ہے بلکہ پاکستان کی مخصوص معاشی صورتحال میں میڈیا مالکان خود بورژوازی کے مضبوط ترین دھڑے کے طور پر ابھرے ہیں اور گزشتہ عرصے میں اس شعبے میں بہت بڑی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس میں بہت زیادہ حصہ کالے دھن اور سٹہ بازی سے بنائی ہوئی رقوم کا بھی ہے۔اسی لیے اس میڈیا کا کردار بھی زیادہ مافیائی اور صحافتی اخلاقی اقدار سے ماورا ہے۔اسی عمل میں بورژوا طبقے کے اندر ان مالکان کے اپنے کسی حد تک نیم آزادانہ گروہی مفادات بھی پروان چڑھے ہیں اور یہی مفادات مختلف ریاستی دھڑوں کی آپسی لڑائی میں اپنی اپنی خدمات بیچتے اور ہمدردیاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔نہ صرف یہ کہ ان ریاستی دھڑوں کی ممکنہ مصالحت میں خوداب کارپوریٹ میڈیا کے مفادات بھی بڑی رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔یہ میڈیا گروپس ضرورت پڑنے پر مختلف دھڑوں کے تضادات کو مزید ابھارتا ہے کیونکہ جس ڈگر اور طریقہ کار سے انہوں نے یہ منڈی حاصل کی ہے اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ یہ ریاستی تصادم بڑھتا رہے اور یہ اس کو فروخت کرتے رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ میڈیا کارپوریشنز دراصل بھوکے، ننگے، غریب مجبور اور بے بس عوام کے زخموں اور پریشانیوں کی تجارت کا نام ہے۔

ان مبصرین، کالم نگاروں اور تجزیہ نگاروں کا چونکہ کوئی نظریہ نہیں ہوتا، ضمیر فروشی اور کاسہ لیسی ان کا مسلک اور روپیہ کمانا ان کا حتمی مقصد بن جاتا ہے اور اگر دانشور اور قلم کار نظریات سے

توبہ تائب کر جائے تو اس کا کردار رنڈی سے بھی زیادہ گھناؤنا ہو جاتا ہے کیونکہ جسم فروشی کی صنعت میں تو پھر بھوک اور غربت کی وجہ سے کچھ لوگ مجبور ہوتے ہیں مگر ضمیر فروشی کا زیادہ تر مقصد مراعات کا حصول ہی ہوتا ہے اور چونکہ ان دانشوروں کا زیادہ تر تعلق مڈل کلاس سے ہوتا ہے اس لیے یہ کلاس تبدیل کرنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں۔

مگر میڈیا اور عدلیہ میں محنت کشوں کی حالتِ زار بدتر سے بدترین ہوتی جارہی ہے۔ایک اینکر پرسن یا مبصر کا معاوضہ جتنا بڑھتا ہے اس کے ساتھ بہت سے محنت کشوں کی اجرتوں میں کٹوتیاں کر دی جاتی ہیں۔ یہ خدمات کے شعبے میں شرح منافع میں بڑھوتری کی بنیادی شرائط میں سے ایک ہے۔اسی طرح جب کسی جج کی تنخواہ بڑھتی ہے تو اس کے ساتھ ہی عدلیہ کے کسی محنت کش کا چولہا کچھ دنوں کے لیے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔عدلیہ اور میڈیا کی مقبولیت کی سیج سے کچھ نیچے ان اداروں کے محنت کشوں کی چھوٹی چھوٹی تحریکیں بھی موجود ہیں جب عوامی بغاوت کا لاوا اپھٹے گا تو یہ محنت کش بھی عوام کے شانہ بشانہ میڈیا کے جعلی خداؤں کو مسترد کرتے ہوئے اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کریں گے اور یہ فیصلہ پرولتاریہ کی قیادت میں سڑکوں، کھلیانوں اور کارخانوں میں ہوگا۔

پاکستان کی موجودہ صورتحال میں بورژوازی کے ایک حصے کی خواہش ہے کہ انڈیا کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنا کر گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیا جائے۔خاص طور پر ٹیکسٹائل کے برآمد کنندگان کو انڈیا کی مڈل کلاس کی قوتِ خرید سے بہت زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔ان توقعات کی جھلک نہ صرف حکومتی پالیسیوں میں نظر آنی شروع ہوئی ہے (انڈیا کو پسندیدہ ملک قرار دینے کی پالیسی) بلکہ نواز شریف بھی کسی حد تک اپنے پرانے شاونسٹ موقف سے پیچھے ہٹا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی حقیقت میں تاجروں، ذخیرہ اندوزوں، ٹیکس چوروں اور پنجابی کاروباری اشرافیہ کا ہی نمائندہ ہے بلکہ سب سے زیادہ با اعتماد نمائندہ ہے اور پاک انڈیا دوستی مخصوص حالات میں امریکی آقاؤں کے مفاد میں بھی ہے۔اس لیے وہ بھی اس معاملے میں کافی سنجیدہ کوششیں کرتے رہے ہیں۔مگر ریاست کا ایک دھڑا اس عمل کو ابھی سے سبوتاژ کرنے کے درپے ہے اور انہوں نے پھر ملکی سالمیت اور نظریہ پاکستان کا پھٹا ہوا ڈھول بجانا شروع کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نواز شریف کے

بھی ان کے ساتھ فاصلے کچھ بڑھ گئے تھے جس کو اب رفتہ رفتہ معمول پر لانے کی کوششیں تیز ہو چکی ہیں۔ پاک بھارت دوستی کے عمل کو ناکام کرنے کے لیے زر خرید ملاؤں اور سیاستدانوں کی خدمات پھر حاصل کر لی گئی ہیں۔ اور نام نہاد کالعدم تنظیموں کو اپنی جنونیت مسلط کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ کیونکہ دوستی اور بہتر تعلقات کے نتیجے میں فوج پر سوالیہ نشان آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ محبت کا ٹوپی ڈرامہ پھر اپنی نفی میں بدل جائے اور خاص طور پر پانی کے مسئلے پر کشیدگی کی فضا بنائی جا سکتی ہے۔ مگر اب یہ ریاست نہ تو جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ ہی امن دے سکتی ہے اس لیے یہ یونہی ہچکولے کھاتی رہے گی مشرقی اور مغربی دونوں سرحدوں پر کشیدگی وقفے وقفے سے نظر آ سکتی ہے۔ یوں ایک مسلسل، ہیجان، اشتعال اور عدم استحکام ہی اس ریاست کا مقدر رہے گا۔ پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں باہمی احترام اور محبت کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے مگر اس دوستی کو این جی اوز کے امن کے کاروبار کے ذریعے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ امن کا یہ انتہائی منافع بخش کاروبار بھی اسی وقت تک جاری رہ سکتا ہے جب تک سرحدوں پر فوجیں موجود ہیں اور نفرت اور حقارت کے بیج بوئے جاتے رہیں۔ امن کا کاروبار کرنے والے اسی وقت تک منافع حاصل کر سکتے ہیں جب تک جنگ کا خطرہ اپنی جگہ موجود رہے۔ جب سرحدوں پر فوجیں نہ رہیں تو امن کے ناٹک کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ اس لئے جنگی جنون پھیلانے والی تنظیموں اور امن کا کاروبار کرنے والوں کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس خطے میں امن اور خوشحالی کے واحد ضامن دونوں ریاستوں کے محنت کش طبقات ہی ہیں جو مشترکہ دکھوں اور محرومیوں کے ان ٹوٹ دھاگے میں پروئے جا چکے ہیں وہ تاریخ کے میدان میں اتریں گے اور برصغیر کی سوشلسٹ فیڈریشن قائم کر کے نفرتوں اور تعصب کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں گے۔

برباد معیشت کی سماجی اذیت

یہ برا حال جو حیات کا ہے
سارا چکر معاشیات کا ہے

ڈاکٹر بیدلؔ حیدری

19 جنوری کو سپریم کورٹ میں توہینِ عدالت کے مقدمے میں پیشی کے وقت تمام تر مصنوعی اعتماد اور ٹھاٹھ باٹھ کے باوجود وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی کی خجالت اور ہزیمت تصنع کے تمام پردوں کو چاک کر کے ان کی باڈی لینگویج سے جھلک رہی تھی اور اس کی تلافی کرنے کے لیے اسی شام قومی اسمبلی کے اجلاس میں ملکی معیشت پر پالیسی بیان دیتے ہوئے انہوں نے اس ڈھٹائی سے جھوٹ بولے کہ سابقہ وزیرِ اعظم اور اعداد و شمار کے گورکھ دھندوں کے بے تاج بادشاہ جناب شوکت عزیز بھی شرما گئے ہوں گے۔ وزیرِ اعظم نے یہ کہنے کی جسارت کی کہ ملکی معیشت درست سمت میں گامزن ہو چکی ہے، درآمدی اخراجات کے مقابلے میں برآمدات مسلسل بڑھ رہی ہیں، تجارتی خسارہ کم ہو گیا ہے اور افراطِ زر 25 فیصد سے کم ہو کر 10 فیصد سے بھی کم یعنی سنگل ڈیجٹ میں آ گیا ہے۔ 6 ماہ کے اندر اندر بجلی اور گیس کے بحران پر قابو پا لیا جائے گا۔ بھوک، ذلت، محرومی اور لاعلاجی کی تکالیف سے کراہتے ہوئے عوام کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ وزیرِ اعظم کسی اور سیارے کی منظر کشی کر رہے ہوں۔ ان تمام اعداد و شمار پر خود حکومتی معاشی ٹیم میں بھی مکمل اتفاقِ رائے ہونا ناممکن ہے اور دوسری طرف بورژوا معاشی ماہرین بھی ایک تواتر کے ساتھ معیشت کی اس کے بالکل برعکس تصویر کشی کر رہے ہیں۔ اس سے قبل 20 نومبر 2011ء کے دی نیوز میں ڈاکٹر فرخ سلیم نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'معاشی انحطاط، 13-2012ء'۔ مذکورہ مضمون میں انہوں نے ملکی معیشت کی موجودہ صورتحال کا کچھ ان الفاظ میں تجزیہ پیش کیا

ہے۔''حالیہ تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان میں نجی شعبے کی نموصفر ہوگئی ہے، حالیہ تاریخ میں پہلی مرتبہ نجی شعبے کے قرضے منفی میں چلے گئے ہیں (81 ارب روپے) یعنی نجی شعبہ سکڑ رہا ہے۔ پہلی مرتبہ ملک کا ہر بچہ، خاتون اور مرد 61000 روپے کا مقروض ہے اور ملکی حکومت سال کے ہر دن 500 کروڑ روپے روزانہ کی اوسط سے دھڑا دھڑ قرضے لے رہی ہے۔ پہلی مرتبہ ہر 10 میں سے 4 پاکستانی غربت کی لکیر سے نیچے گر گئے ہیں۔۔۔۔ مجموعی طور پر 7 کروڑ 30 لاکھ لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔۔۔۔ زندہ رہنے کی لاگت بڑھتی جا رہی ہے اور زندگی کے امکانات مخدوش ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشی انحطاط پذیری کا آغاز ہو چکا ہے۔''

4 جنوری 2012ء کے 'دی نیوز' میں اشفاق ایچ حسن 'معاشی چیلنج 2012ء' کے عنوان سے ایک مضمون کا اختتام کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں ''معاشی ترقی کی شرح کا آئندہ برس بھی گزشتہ برس کی طرح 3 فیصد یا اس سے کم ہی رہنے کا امکان ہے۔ برباد ہوتے ہوئے کاروباری ماحول کی وجہ سے داخلی سرمایہ کاری میں اضافے کا کوئی امکان نہیں۔ بیروزگاری اور غربت میں مزید اضافہ ہوگا۔ گورنمنٹ کی طرف سے قیمتوں میں احمقانہ اضافے کے باعث افراطِ زر کا دباؤ مزید بڑھ جائے گا۔ برآمدات کی بہت ہی کم یا حتیٰ کہ ممکنہ طور پر منفی شرح نمو کی وجہ سے بیرونی ادائیگیوں کا توازن شدید دباؤ کا شکار ہوگا۔ مختصر یہ کہ 2012ء گزشتہ چار سالوں سے زیادہ بدترین ہو گا۔ معیشت بغیر کسی منصوبے کے بلیک ہول کی طرف بڑھ رہی ہے۔ خدا ہی 2012ء میں امن، استحکام اور خوشحالی لاسکتا ہے۔''

معیشت کے عالمگیر کردار کی وجہ سے چند سادہ لوح نیک تمنائیں رکھنے والے خواتین و حضرات کی توقعات کے بالکل برعکس عالمی معاشی بحران نے ملکی معیشت پر بھیانک اثرات مرتب کیے ہیں اور سنجیدہ معیشت دانوں کی رائے میں 2020ء تک عالمی معیشت میں کسی قسم کی بہتری کے امکانات موجود نہیں ہیں۔ 2011ء میں عالمی معیشت کی شرح نمو 3.7 فیصد رہی جو 2012ء میں مزید کم ہو کر 3.2 فیصد تک گرنے کا امکان ہے اور اگر یہ آنے والے سالوں میں 3 فیصد سے نیچے آتی ہے تو عالمی کساد بازاری کے خطرات 40 فیصد سے تجاوز کر جائیں گے اور ایسی

کیفیت میں پاکستان کی معیشت جو پہلے ہی سست روی کا شکار ہے تباہی کے دہانے پہ پہنچ جائے گی۔شرح نمو جو 2007ء میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 7 فیصد سے زائد تھا اب 3 فیصد سے بھی کم ہے۔مالیاتی خسارہ GDP کے 6 فیصد سے بڑھ چکا ہے۔قدرتی آفات اور دہشت گردی کے خلاف جنگ نے معیشت کو بالکل نچوڑ کے رکھ دیا ہے۔2010ء کے سیلاب سے مجموعی طور پر 2 کروڑ سے زیادہ لوگ متاثر ہوئے اور معیشت کو 10 ارب ڈالر سے زائد کا نقصان برداشت کرنا پڑا اور 2005ء کے زلزلے کے وقت اچھی خاصی بیرونی امداد مل گئی تھیں کیونکہ اس وقت عالمی معیشت میں ایک ابھار تھا اگرچہ وہ امداد بھی متاثرہ علاقوں کی تعمیرِ نو سے زیادہ بیوروکریٹس ،جرنیلوں اور بدعنوان سیاستدانوں کی ہوسنا کی کا شکار ہوگئی تھیں مگر اس سیلاب کے نام پر تو ریاست کو زیادہ بھیک بھی نہیں مل پائی کیونکہ عالمی معیشت میں پہلے ہی شدید بحران تھا۔اس لیے متاثرہ لوگ ابھی تک کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کے مطابق دہشت گردی کے خلاف جنگ میں معیشت کو روزانہ 4.5 ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے اور مجموعی طور پر اب تک اس نام نہاد جنگ میں 77 ارب ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔صرف 2010ء میں دفاع ،دہشت گردی کے خلاف جنگ اور زرِاعانت کی مد میں پاکستان کی کل 1200 ارب ڈالر کی معیشت کو 17 ارب ڈالر کے اخراجات برداشت کرنے پڑے۔

ان تمام معاشی اور مالیاتی مسائل کی وجہ سے حکومت اور معاشی ٹیکنوکریٹس کے مابین پہلے دن سے ہی کشیدگی موجود رہی ہے اور 4 سالوں میں مرکزی بینک کے یہ چوتھے گورنر کام کر رہے ہیں اور اسی طرح اس پارلیمنٹ میں یہ چوتھے وزیرِ خزانہ ہیں۔اس سے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور رپورٹس کے مطابق موجودہ ٹیم میں بھی شدید اختلافِ رائے موجود ہے۔خاص طور پر داخلی حکومتی قرضوں کے معاملے میں حکومت سٹیٹ بینک کو مسلسل ڈکٹیٹ کرتی رہی ہے۔گزشتہ عرصے میں پالیسی ریٹ میں 2 فیصد تک کی کردی گئی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ سٹیٹ بینک کی یہ ٹیم کب تک اس حکومتی ٹیم کے ساتھ کام کر پائے گی یا حکومت کی ممکنہ تبدیلی کی صورت میں آئندہ برسوں میں نئے منصوبہ ساز اس آزمائش سے کس طرح نبرد آزما ہوں گے۔روپے کی قدر

تاریخ کی کم ترین سطح پر پہنچ گئی ہے۔ایک ڈالر 92 روپے میں فروخت ہو رہا ہے جو جولائی 2011ء میں 85 روپے کا تھا۔

روپے کی حالیہ گراوٹ کے سبب صرف 4 ہفتوں میں ملکی قرضوں میں 400 ارب روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔اسی طرح غیر ملکی قرضوں کا حجم بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور سود کی ادائیگیوں کا بوجھ بڑھنے سے ادائیگیوں کے توازن میں شدید بگاڑ پیدا ہوگا جس سے کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ اور بجٹ خسارہ بھی بڑھ جائے گا جس کو پورا کرنے کے لیے مزید قرضوں کی ضرورت پڑے گی۔روپے کی قدر میں کمی سے برآمدات میں جو ممکنہ اضافہ ہوسکتا ہے وہ توانائی کے بحران اور امن وامان کی صورتحال کے پیشِ نظر قابلِ عمل دکھائی نہیں دیتا۔برآمدات میں جو تھوڑا بہت اضافہ ہوگا بھی وہ صنعتی درآمدات کے بوجھ تلے دب جائے گا۔داخلی اور خارجی محرکات کے اجتماعی اثرات کی وجہ سے پیداواری لاگت میں خاطر خواہ اضافہ ممکن ہے۔پہلے ہی عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان پایا جاتا ہے۔اگرچہ تیل کی طلب میں بڑے پیمانے پر اضافے کے امکانات نہیں ہیں مگر پھر بھی ایران پر پابندیوں اور اسرائیل اور امریکہ کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے ساتھ بھی ایران کی کشیدگی اور طویل ہوتی ہوئی حالتِ جنگ یا ممکنہ سرجیکل سٹرائیک کی وجہ سے سٹے باز اس کیفیت میں داخل ہو کر تیل کی قیمتوں میں مخصوص دورانیے کے لیے اضافے کا باعث بن سکتے ہیں۔اس وقت تیل عالمی مارکیٹ میں 112 ڈالر فی بیرل میں فروخت ہو رہا ہے اور کسی بھی قسم کی مہم جوئی کی وجہ سے یہ 130 ڈالر فی بیرل سے تجاوز کر سکتا ہے۔پاکستان پہلے ہی عالمی مارکیٹ میں گرتی ہوئی قیمتوں کے باوجود ملک کے اندر مسلسل پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے کے ذریعے ریاستی اخراجات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔عالمی منڈی میں اس قسم کا ممکنہ اضافہ معیشت کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوسکتا ہے۔یوں درآمدی اخراجات میں برآمدات کے تناسب سے بڑے پیمانے پر اضافہ ہوگا جس سے تجارتی خسارہ بھی مزید بڑھ جائے گا جو پہلے ہی رواں مالی سال کے پہلے چھ ماہ میں 11.5 ارب ڈالر کے قریب پہنچ گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی رواں مالی سال میں بجٹ خسارہ 1200 ارب روپے کی ریکارڈ سطح تک پہنچنے کا

امکان ہے جو GDP کے 6.5 فیصد کے برابر ہوگا۔

جدید صنعتی نظام میں توانائی کا وہی کردار ہے جو انسانی جسم میں آکسیجن کا ہے۔ درحقیقت یہ بھاپ کے انجن کی ایجاد ہی تھی جس نے ساری انسانی تاریخ کے دھارے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پاکستان کے حکمران طبقے کی نااہلی اور خصی پن کا اندازہ پاکستان کے توانائی کے شعبے کی حالتِ زار کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ ملک کو توانائی کے بحران کی وجہ سے روزانہ ایک ارب روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ ماہرِ اقتصادیات اور سابق مشیر وزارتِ خزانہ ڈاکٹر حفیظ اے پاشا کے مطابق صرف بجلی کے بحران سے معیشت کو سالانہ 7 ارب ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔ بے شمار وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود گھریلو صارفین اور پیداواری شعبہ توانائی کے بحران کی وجہ سے انتہائی اذیت میں مبتلا ہے۔ پاکستان میں توانائی کا شعبہ 50 فیصد گیس، 29 فیصد آئل، 11 فیصد پن بجلی (ہائیڈرو)، 7.6 فیصد کوئلے اور نیوکلیئر انرجی پر مشتمل ہے۔ ماہرین کے مطابق پانی سے 40000 میگاواٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے جبکہ صرف 4 ہزار 500 میگاواٹ بجلی پیدا کی جارہی ہے۔ صحرائے تھر کا آج کل بہت شور ہے جہاں پر دنیا کے ساتویں بڑے یعنی 175 ارب ٹن کوئلے کے ذخائر موجود ہیں۔ جن کو استعمال کرنے کی صلاحیت سے یہ نظام اور اس کا حکمران طبقہ عاری ہے۔ سندھ میں 186 ارب ٹن، پنجاب میں 235 ملین، بلوچستان میں 217 ملین، خیبر پختونخواہ میں 90 ملین جبکہ آزاد کشمیر میں 9 ملین ٹن کوئلے کے ذخائر ہیں جبکہ ملک میں کوئلے سے صرف 2 فیصد بجلی پیدا کی جارہی ہے۔ میڈیا اور حکمران طبقات کے تمام تر شور وغل کے باوجود بجلی کا بحران درحقیقت ایک مصنوعی بحران ہے کیونکہ اس وقت بھی 21000 میگاواٹ کی پیداواری صلاحیت موجود ہے جبکہ ملکی ضروریات 14000 میگاواٹ کے لگ بھگ ہیں۔ بجلی چوری کی لاگت بھی دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ حالیہ رپورٹ کے مطابق بجلی چوری کی وجہ سے سالانہ نقصان 103 ارب روپے تک پہنچ چکا ہے۔ مگر نجی شعبے اور طفیلیے سرمایہ داروں کی ہوس کے سامنے پالیسی سازوں کی بے بسی کی وجہ سے مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتوں میں بیش بہا اضافے کے ذریعے اربوں روپے کے منافعے کمائے جارہے ہیں۔ حکومت کی پالیساں جلتی پر تیل کا کام کر رہی

ہیں۔ پاکستانی بجلی کے شعبے میں عملاً خسارے قومیا لیے جاتے ہیں اور منافعے پرائیوٹائز کردیئے جاتے ہیں۔ IPP's کو دی جانے والی سبسڈیز اس کی بہترین مثال ہیں۔ عوام کی سبسڈیز میں مسلسل کٹوتیاں کی جارہی ہیں اور پرائیویٹ اداروں کی سبسڈیز میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ حیران کن حد تک بینک جو IPP's کو ماہانہ ٹیرف کی مد میں فنانس کرتے ہیں اس کے بھی 80 فیصد اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ پچھلے دس سالوں میں شرح مبادلہ کو اگر مستقل تصور کیا جائے تو بینکوں کو IPP's کی سود کی ادائیگیاں 56 ملین ڈالر ہیں جبکہ پبلک سیکٹر کی ادائیگیاں 45 ملین ڈالر ہیں جس میں 11 ملین ڈالر کا فرق ہے جبکہ دونوں کے قرضوں کو حکومت کو ہی فنانس کرنا ہوگا۔ یعنی ایسی کیفیت میں جب عام لوگ بجلی کی کمی کی وجہ سے بدترین حالاتِ زندگی میں گزارہ کررہے ہیں تو دوسری طرف بجلی کے نجی مالکان کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔

حال ہی میں گیس کے بحران نے نظامِ زندگی کو مکمل مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ 3 برسوں میں گیس کی طلب میں سالانہ 6 فیصد اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ بجلی کی بڑے پیمانے پر عدم دستیابی ہے اور آئندہ تین برسوں میں اس میں بڑی رفتار سے اضافہ متوقع ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 13-2012ء میں ملک میں گیس کی یومیہ کمی 2 ارب کیوبک فٹ، 15-2014ء میں 2.5 ارب، 16-2015ء میں 3 ارب اور 17-2016ء میں 3.5 ارب کیوبک فٹ سے زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس وقت توانائی کے شعبے میں 650 ارب روپے کے قرضے گردش کررہے ہیں۔ ڈاکٹر فرخ سلیم کے خیال میں گیس کے بحران کی ایک اور بڑی وجہ چوری ہے۔ روزانہ 500 ملین کیوبک فٹ گیس چوری یا ضائع ہوجاتی ہے جس سے دونوں بڑی سوئی سادرن اور سوئی ناردرن گیس کمپنیوں کو 30 ارب سالانہ کا خسارہ ہوتا ہے۔ گزشہ 4 سالوں میں چوری میں دو تہائی سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق OECD ممالک میں خارج از حساب گیس کی مقدار ایک سے دو فیصد ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں یہ 13 فیصد ہے اور ہر ایک فیصد ضیاع سے کمپنیوں کو ڈھائی ارب روپے کا نقصان ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں یہ سارا حساب محنت کش عوام کو ہی چکانا پڑتا ہے۔ اس میں گیس

کے پیداواری شعبے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ اور نجکاری کی پالیسی نے صورتحال کو عوام کے لئے مزید اذیت ناک بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ منصوبہ سازوں کی نا اہلی اور بدعنوانی صورتحال کو اور بھی تشویشناک بنا دیتی ہے۔ گو کہ CNG گیس کی کل کھپت کا ایک معمولی حصہ ہے لیکن یہاں ناقص منصوبہ بندی، اقربا پروری اور منافع خوری سے مسائل میں کئی گنا اضافہ ہوا، مثال کے طور پر گزشتہ برسوں میں حکمرانوں کی جانب سے اپنے عزیز واقارب کو بڑے پیمانے پر CNG پمپ لائسنس ایشو کیے گئے اور دھڑا دھڑ CNG گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ روزنامہ جنگ کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں تقریبا35 لاکھ گاڑیاں CNG پر چلتی ہیں۔ جو آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ تعداد ہے اور پھر ان میں حفاظتی اقدامات کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ جس کی وجہ سے سلنڈرز پھٹنے کی وجہ سے حادثات کا تناسب بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ صرف دسمبر 2011ء میں گیس کے سلنڈر پھٹنے کی وجہ سے پبلک ٹرانسپورٹ میں حادثات کے باعث 60 سے زیادہ لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ CNG کے شارٹ فال نے ٹرانسپورٹ کے شعبے کی پہلے سے انتہائی انسانیت سوز صورتحال کو اور بھی نا قابلِ برداشت کر دیا ہے۔ یوں توانائی کے شعبے کی اس مجموعی حالتِ زار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان کی پیداواری معیشت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

2011ء میں گرچہ معاشی شرح نمو 2.7 فیصد کے لگ بھگ رہی مگر اس میں بڑا حصہ خدمات اور زراعت کے شعبے کا تھا۔ پیداواری معیشت کی شرح نمو درحقیقت منفی میں چلی گئی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری جسے نام نہاد ترقی پذیر ممالک کی معیشتوں میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے بڑھنے کی بجائے مسلسل گر رہی ہے۔ گزشتہ 6 ماہ میں سٹیٹ بینک کی رپورٹ کے مطابق ساڑھے چودہ کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کا اخراج ہوا ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کا حجم 2008ء میں 5.4 ارب ڈالر تھا جواب کم ہو کے ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ رہ گیا ہے۔ یوں پیداواری صلاحیت بڑھنے کی بجائے مسلسل سکڑ رہی ہے۔

ملک کی کل برآمدات 28 ارب ڈالر کے قریب ہیں جن میں ٹیکسٹائل کی صنعت کا حصہ 55

فیصد ہے۔ صنعتی شعبے میں 37 فیصد ملازمتیں ٹیکسٹائل کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ملک کی مجموعی قومی پیداوار میں اس کا حصہ 8.5 فیصد ہے۔اس صنعت میں مجموعی سرمایہ کاری 515 ارب روپے تک ہے۔حالیہ برسوں میں اس میں اضافہ ہونے کی بجائے کمی آئی ہے اور بہت ساری سرمایہ کاری بنگلہ دیش اور سری لنکا جیسے ممالک کا رخ کر رہی ہے۔آنے والے دنوں میں یورپ اور امریکہ میں طلب میں مسلسل کمی اور ملک میں جاری توانائی کے بحران کی وجہ سے یہ شعبہ شدید مشکلات کا شکار ہوگا۔آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن (اپٹما) کے مطابق اسے صرف دسمبر میں گیس اور بجلی بحران کی وجہ سے ایک سو کروڑ ڈالر کا خسارہ ہوا۔جرمنی میں حال ہی میں عالمی ٹیکسٹائل میلے کا انعقاد کیا گیا جہاں پاکستانی برآمد کنندگان کو بڑے آرڈرز کی توقعات تھیں اور اسی وجہ سے وہاں پاکستانی ٹیکسٹائل کے 248 سٹال لگائے گئے تھے جو دنیا میں تعداد کے حوالے سے چوتھے نمبر پر تھے۔مگر عالمی درآمد کنندگان نے پاکستان کو اس بنیاد پر زیادہ آرڈرز دینے سے انکار کر دیا کہ توانائی کے بحران کی وجہ سے وقت پر مال ملنے کے حوالے سے ان کے شکوک وشبہات تھے اور بڑی مشکل سے سیاسی چارہ جوئی کے ذریعے کچھ آرڈر لینے میں کامیاب ہوئے۔

اسی صورتحال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے باقی پیداواری شعبوں کی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔پیداواری معیشت کا یہ انہدام بیروزگاری کی شرح میں تیز ترین اضافے کا باعث بن سکتا ہے پہلے ہی بیروزگاری کی شرح 20 فیصد سے تجاوز کر چکی ہے۔ملک میں 2 کروڑ سے زائد لوگ بیروزگار ہیں اور ایک کروڑ کے قریب اپنی ذہنی اور جسمانی استعداد سے کم پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔نیکسٹ جنریشن کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان کو اگلے دس برس میں 3 کروڑ 60 لاکھ مزید نئی اسامیاں درکار ہوں گی۔

سوشل انفراسٹرکچر بڑھنے کی بجائے دن بدن سکڑتا جا رہا ہے۔ٹرانسپورٹیشن،علاج اور تعلیم کے علاوہ خدمات کے دیگر شعبے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ریلوے، پی آئی اے، نیشنل ہاؤسنگ سوسائٹی، پاکستان سٹیل وغیرہ کے واجب الادا قرضوں اور واجبات کا تخمینہ 597 ارب روپے سے بڑھ چکا ہے۔ان پبلک سیکٹر انٹرپرائز کو روزانہ ایک سو کروڑ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔

صرف پیپکو کو روزانہ پچاس کروڑ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ صرف ریلوے کی حالتِ زار کی وجہ سے ہمارے قومی قرضے میں 600 ملین ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ اور معزز ماہرینِ معیشت ان تمام بیماریوں کا شافی علاج صرف نجکاری کو ہی قرار دیتے ہیں جبکہ نجکاری کیے گئے اداروں کی صورتحال اس سے بھی بدتر ہے KESC کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ درحقیقت وہ اس بنیادی حقیقت کی پردہ پوشی کرتے ہیں کہ ان تمام مسائل کی بنیادی وجہ نجی ملکیت کا یہ خونخوار نظام ہی تو ہے۔

انفراسٹرکچر کی حالت ہر شعبے میں مسلسل خراب ہوتی جا رہی ہے۔ سوشل انفراسٹرکچر کے شعبے میں بڑی انویسٹمنٹ کی ضرورت ہے جبکہ حکومتیں مسلسل ترقیاتی فنڈز میں کٹوتیاں کرتی رہی ہیں۔ نئے ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کی بجائے پہلے سے جاری ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل ہی ایک بھیانک خواب بنتی جا رہی ہے۔ حکومت نے سیاسی دباؤ کی بنیاد پر ریاستی معاشی گنجائش سے بڑھ کر ترقیاتی پراجیکٹس کی منظوری کا اعلان کیا تھا جو اب شدید خسارے کا شکار ہو چکے ہیں۔ 25 جنوری کی روزنامہ جنگ کی ایک رپورٹ کے مطابق بعض ترقیاتی منصوبوں پر اخراجات میں 415 فیصد اضافہ ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر 3100 ارب کے اعلان کردہ ترقیاتی منصوبے جمع ہو گئے ہیں۔ PSDP کے جائزے کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کسی بھی مالی سال کے آغاز پر سرکاری شعبے کے ترقیاتی منصوبوں کی جاری ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کردہ رقم نفی کر کے تخمیناً لاگت ظاہر کی جاتی ہے۔ وفاقی سطح پر آئندہ بجٹ میں ظاہر کی جانے والی رقم پر خسارہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس کی وجہ ان منصوبوں پر ضرورت سے کم رقم کا مختص کیا جانا ہے اور اس پر لوٹ مار اور بدعنوانی اس صورتحال کو بھیانک کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ حکومت اس لوٹ مار اور بدعنوانی کو روکنے کی اہل ہی نہیں ہوتی کیونکہ یہ تمام ٹھیکے سیاسی بنیادوں پر ہی تو دیئے جاتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ غلط نہ ہوگا کہ یہاں کی مخصوص سیاسی ثقافت میں مڈل کلاس کی سیاسی وفاداری کی بنیاد ہی ان ٹھیکوں سے مشروط ہوتی ہے۔ گزشتہ پانچ سال میں اگلے مالی سال میں لیے جانے والے منصوبوں کی رقم 7-2006ء کے دوران ایک ہزار ارب روپے سے بڑھ کر 11-2010ء کے دوران 2600 ارب روپے ہو گئی ہے۔ جو 12-2011ء میں 3100

ارب روپے تک پہنچ جائے گی۔

آبادی اگلے 20 برس میں 44 فیصد بڑھ جائے گی۔مگر چونکہ روزگار کے مواقع بڑھنے کی بجائے اور بھی مخدوش ہونے کا امکان ہے اس لیے آبادی کی بڑی اکثریت کو سوائے رسوائی اور خجالت کے اور کچھ نہیں ملے گا۔جبکہ اگر ان لوگوں کی صلاحیتوں کو درست طریقے سے استعمال کیا جائے تو یہاں کے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے چند سالوں میں اس خطے کو جنتِ ارضی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور بہترین سوشل انفراسٹرکچر تعمیر کیا جاسکتا ہے۔صرف دس لاکھ لوگوں کی افرادی قوت کے درست استعمال کے ذریعے صرف تین ماہ میں کالا باغ ڈیم بنایا جاسکتا ہے،صرف دس ماہ میں چالیس شہروں سے منسلک M2 معیار کی موٹرویز ملک بھر میں تعمیر کی جاسکتی ہیں اور اسی افرادی قوت کے ذریعے اتنی گندم بآسانی پیدا کی جاسکتی ہے جس سے دو کروڑ لوگوں کی سات سال تک ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں اور صرف دس سالوں میں اس ملک میں تاریخ کا سب سے ترقی یافتہ معاشرہ تعمیر کیا جاسکتا ہے مگر اس کے لیے اس حکمران طبقے اور نظام کو فیصلہ کن شکست سے دوچار کرنا ہوگا اور ایک منصوبہ بند معیشت کا قیام عمل میں لانا ہوگا۔

اس خونخوار حکمران طبقے نے معیشت کو مرض الموت میں مبتلا کر دیا ہے۔توانائی کی آکسیجن کے بغیر معیشت بلک بلک کر اور سسک سسک کر مر رہی ہے اور اسے محض قرضوں کی مصنوعی آکسیجن کے ذریعے زندہ رکھا گیا ہے۔ڈاکٹر اشفاق ایچ خان کے مطابق جون 2007ء کے آخر میں سرکاری قرضہ 48 کھرب روپے تھا جو جون 2011ء میں 110 کھرب تک پہنچ گیا ہے۔یعنی صرف چار سال میں قرضے کا حجم دوگنا سے زائد ہوگیا ہے اور اس میں 23 فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔جون 2007ء میں قرضہ GDP کا 55 فیصد تھا اور اب 60 فیصد سے زیادہ ہے۔جون 2007ء میں بیرونی قرضہ 40 ارب ڈالر تھا جو اب بڑھ کر 60 ارب ڈالر ہو چکا ہے۔پاکستان کو اس سال 4.7 ارب ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی کرنی ہے جس میں سے 1.356 ارب ڈالر آئی ایم ایف کو ادا کرنا ہے۔مجموعی طور پر اس سال آئی ایم ایف کو 3.5 ارب ڈالر تک واپس کرنے پڑ سکتے ہیں۔امریکہ کے ساتھ کشیدگی اور آئی ایم ایف کے سٹینڈ بائی پروگرام سے باہر

آنے کی وجہ سے داخلی قرضوں پر انحصار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔سٹیٹ بینک سے قرضوں کا حجم پہلے ہی بہت زیادہ ہے اس لیے کمرشل بنکوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور کمرشل بینکوں سے قرضہ زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔بجٹ میں اخراجات کی سب سے بڑی مد سودی ادائیگیاں ہیں اور یہ 90 فیصد ملکی قرضے پر ہیں۔ملکی قرضے کا نصف 33 کھرب روپے قلیل مدتی معیاد کا ہے۔جسے سال میں کم سے کم ایک دفعہ رول اوور کرانا ضروری ہے۔جوں جوں کمرشل بینکوں پر انحصار بڑھتا جائے گا شرح سود میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی اصول ہے جس چیز کی طلب جتنی بڑھے گی وہ اتنی ہی مہنگی ہوتی جائے گی اور حکومتی قرضے کی طلب میں آنے والے دنوں میں بے پناہ اضافہ متوقع ہے۔لیکن یہ عمل لا امتناعی انداز میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ہم پہلے ہی یورو زون اور امریکہ میں قرضوں کا ایک بہت بڑا بحران دیکھ چکے ہیں۔قرض اگرچہ بحران سے نکلنے کا ایک آسان راستہ ہوتے ہیں مگر جب قرضوں کا بحران جنم لیتا ہے تو پھر باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔اگرچہ پاکستان میں فوری طور پر ایسی صورتحال نہیں ہے مگر وہ تمام عوامل پک کر تیار ہو رہے ہیں جو اس قسم کی صورتحال کا موجب بنتے ہیں۔امریکہ اور یورپ کو بحران سے نکالنے کے لیے چین نے بڑے پیمانے پر ان کے قرضے خریدے مگر اس خطے کی مخصوص سیاسی صورتحال کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان پر اگر اس قسم کا وقت آتا ہے تو شاید اس کو بچانے کوئی بھی نہ آئے۔ریاست کے جن دھڑوں کو چین سے بہت زیادہ توقعات وابستہ ہیں انہیں ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ چین اپنے معاشی نظام کی پیچیدگیوں کی وجہ سے مغرب کے ساتھ ایک خاص قسم کے 'love hate relationship' میں منسلک ہے اور اگر امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات میں کشیدگی بڑھتی رہتی ہے تو چین کی دوستی خاموش تماشائی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ہم ایران کے معاملے پر پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ چین بہت زیادہ بڑھک بازی کرنے کے بعد نسبتاً خاموش ہو گیا ہے اور اس نے ایران سے تیل کی خریداری بھی 50 فی صد تک کم کر دی ہے۔مختصر یہ کہ پاکستان کو اس نظام میں رہتے ہوئے ہر صورت میں امریکہ اور عالمی مالیاتی اداروں کی کاسہ لیسی کرنی ہو گی جیسا کہ ایک بڑی مشہور کہاوت ہے کہ سمندر میں رہنا ہو تو مگر مچھ سے بیر نہیں رکھنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسی صورتحال سے بچنے کے لیے سنجیدہ معاشی ماہرین پاکستانی ریاستی اداروں کو امریکہ اور آئی ایم ایف کے ساتھ تعلقات کو بہتر کرنے اور شاونسٹ نعرے بازی کو ترک کرنے کے نیک مشورے دے رہے ہیں۔ مگر اگر ان نیک مشوروں پر عمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان سے سنگین سیاسی تناؤ جنم لے گا جس کا ذکر ہم کسی اور باب میں کریں گے۔ لیکن اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو اس سے محض بحران کو آگے کی طرف دھکیلا ہی جا سکتا ہے مکمل ختم نہیں کیا جا سکتا اور یہ اگلے برسوں میں زیادہ دیوہیکل شکل میں اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ ایک اور صورت میں اگر عالمی قوتیں اپنے اپنے مفادات کی وجہ سے اس مرتی ہوئی معیشت کو سہارا دیتی ہیں اور یہ گراوٹ کسی جگہ جا کے ٹھہرتی ہے یا کسی بھی سطح کی جزوی بہتری آتی ہے تو وہ لوگوں کی بے پناہ مشکلات میں تو شاید آٹے میں نمک کے برابر ہی کمی کریں گی مگر وہ عوامی شعور کو جھنجھوڑ کر ایک بہت بڑے سیاسی طوفان کو مشتعل کر سکتی ہیں جس کا سامنا کرنے کی سکت ان سامراجیوں اور ان کے گماشتے مقامی حکمرانوں میں نہیں ہے۔

یہی کمرشل بینک جو آج بہت زیادہ شرح سود سے مستفید ہو رہے ہیں ان کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ ریاست بہت جلد ان قرضوں کی واپسی کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر فرخ سلیم اس صورتحال کی منظر کشی 20 نومبر 2011ء کے دی نیوز میں ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ''زیادہ مستقبل بعید میں نہیں بلکہ جلدی ہی ہم اپنے 60 ارب ڈالر کے بیرونی قرضے کے سود کی ادائیگی کے قابل نہیں رہیں گے اور اپنے 60 کھرب روپے کے داخلی قرضوں کی سروس کے لیے ہمارے پاس نوٹ چھاپنے، نوٹ چھاپنے اور نوٹ چھاپنے کے علاوہ کوئی دوسری آپشن نہیں رہ جائے گی۔'' گویا کہ پاکستانی حکمران طبقہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی بریکس فیل ہو چکی ہیں اور وہ بہت تیزی سے رواں دواں ہے۔

اس کے ساتھ ہی اگر ٹیکس ریونیو کے مطلوبہ اہداف حاصل نہ کیے جا سکے تو حکومتی مالیاتی اور بجٹ خسارے کو پورا کرنے کے لیے قرضوں پر انحصار مزید بڑھتا چلا جائے گا اور موجودہ بینکنگ سیکٹر اتنے بڑے بوجھ کی استعداد نہیں رکھتا۔ اسی لیے حکومت ٹیکس ریونیو کو بڑھانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے مگر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نظر نہیں آئی۔ 2 جنوری کے ڈان میں اشفاق

بخاری ٹیکس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ FBR کسی بھی طریقے سے ٹیکس نیٹ کو بڑھانے کے لیے بہت زیادہ پرعزم ہے مگراس کے باوجود 2012ء میں بہت بڑی کامیابی کی توقع نہیں ہے۔اس مایوسی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملکی قانون میں اس حوالے سے مخصوص لوگوں کے لیے ٹیکس سے بچنے کے لیے مختلف راستے موجود ہیں۔ٹیکس ریونیو کو بڑھانے کے لیے بڑی قانونی اصلاحات کی ضرورت ہے مگراس کا امکان اس لیے نہیں کیونکہ ان قوانین سے فائدہ اٹھانے والے خود پارلیمنٹ میں موجود ہیں۔معیشت کا سب سے بڑا شعبہ یعنی زراعت قانونی طور پر ٹیکس سے مبرہ ہے اور صرف لینڈ ٹیکس کی ہی اجازت ہے اور وہ بھی صرف صوبوں کو۔یوں 18 کروڑ سے زائد کی آبادی میں سے صرف 30 لاکھ سے کم ہی انکم ٹیکس دیتے ہیں اور شرمناک بات یہ ہے کہ ان میں حکومتی اور پرائیویٹ اداروں کے کم تنخواہ والے ملازمین بھی شامل ہیں۔پاکستان میں ٹیکس کی شرح GDP کے 9 فیصد کے برابر ہے جو دنیا میں کم ترین ہے حتیٰ کہ افریقہ کے پسماندہ ترین ممالک سے بھی کم۔2010ء میں صرف 19 لاکھ لوگوں نے ٹیکس ادا کیا حالانکہ رجسٹرڈ ٹیکس دہندگان کی تعداد 32 لاکھ تھی۔مئی 2011ء میں FBR نے سات لاکھ ایسے افراد کی لسٹ شائع کی جو ایک سے زیادہ گھر اور کار کے مالک ہیں، بیرونِ ملک سفر کرتے ہیں، بینک اکاؤنٹس رکھتے ہیں مگر ٹیکس ادا نہیں کرتے۔''یوں گزشتہ برسوں میں براہِ راست ٹیکسوں کے حجم میں اضافہ ہونے کی بجائے مسلسل کمی کا رجحان پایا جاتا ہے۔اسی وجہ سے بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافے کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ کار نہیں بچتا جس کا بوجھ پہلے سے غربت سے سسکتے اور بلکتے عوام کے اوپر ہی ڈالا جاتا ہے۔دو سال سے حکومت ویلیو ایڈڈ ٹیکس کے نفاذ کی کوششیں کرتی رہی ہے مگر اس پر اسے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے اسی طرح گزشتہ برس ریفارمڈ جنرل سیلز ٹیکس نافذ کیا گیا تھا۔آئندہ برسوں میں بھی اسی قسم کے ٹیکس نافذ کرنے پڑیں گے جس کی وجہ سے اس حکومت اور آئندہ نئی حکومت کو بھی اپنے آغاز میں ہی شدید سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

زرِمبادلہ کے ذخائر ابھی 16 ارب ڈالر کے لگ بھگ ہیں مگر ان کو برقرار رکھنے کے لیے ابھی تک حکومت قرضوں کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک میں مقیم تارکین کی ترسیلاتِ زر میں مسلسل

اضافے پر بھی بہت زیادہ انحصار کر رہی ہے۔ایک طرف تو اس برس بیرونی ادائیگیوں کے شدید دباؤ کی وجہ سے ان ذخائر میں بڑی گراوٹ کے آثار نظر آ رہے ہیں تو دوسری طرف ترسیلاتِ زر جن کا حجم 11 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے میں بھی کمی ممکن ہے۔مگر عالمی معاشی بحران کے حوالے سے معاشی ماہرین کے تجزیوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں کسی قسم کی واضح ریکوری کا امکان نہیں ہے اور اگر 2012ء کے آخر تک عالمی سست روی میں بہتری نہیں آتی تو نہ صرف پاکستان بلکہ دیگر ترقی پذیر معیشتوں کو بھیجی جانے والی ترسیلاتِ زر میں بڑی گراوٹ دیکھنے میں آ سکتی ہے۔جس سے ایک طرف بینکوں کو لیکویڈیٹی کے بحران کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور دوسری طرف رئیل سٹیٹ میں بھی بڑے بحران کے امکانات روشن ہو جائیں گے جس کی وجہ سے سٹاک ایکسچینج جو گزشتہ برسوں میں مسلسل گراوٹ کا شکار رہی ہے اس پر بھی دباؤ میں اضافہ ہو گا۔یوں سارے کے سارے معاشی سائیکل کے منہدم ہونے کے خطرات دن بدن بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے دیگر معذرت خواہان کرپشن کے خاتمے کو تمام مسائل کا حل قرار دیتے ہیں اور یہ بات درست بھی ہے کہ کرپشن کی وجہ سے سرکاری اور قانونی معیشت کو سالانہ اربوں روپے کا نقصان ہوتا ہے مگر غیر سرکاری اور غیر قانونی معیشت کے حجم میں اضافہ ہوتا ہے جس سے لاکھوں خاندانوں کا چولہا گرم رہتا ہے۔یوں کرپشن اس نظام کی خرابی کی وجہ نہیں بلکہ اس نظام کی ناگزیر ضرورت اور پیداوار ہے۔اس کا اخلاقی بنیادوں پر تجزیہ کرنے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ڈاکٹر فرخ سلیم 8 جنوری 2012ء کے دی نیوز میں اس کا تجزیہ کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''پاکستان میں ہم کرپشن کی بات بھی کرتے ہیں اور اس میں شامل بھی ہوتے ہیں۔کیا اس لئے ضروری ہے کہ ہماری زندہ رہنے کے لئے درکار بنیادی اقدار آزادئ اظہار کی اقدار سے زیادہ ضروری ہیں؟ آخر ماسلو کی 'ضروریات کی ترتیب' میں بھی کھانا، پانی، جسم کا تحفظ اور روزگار سب سے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جبکہ اخلاقیات، تخلیقی صلاحیت، حقائق کو تسلیم کرنا وغیرہ بہت بعد میں آتے ہیں۔''

حکومت نے زراعت کے شعبے سے بہت سی توقعات وابستہ کی ہوئی ہیں۔ملکی ترقی کے جو تخمینے لگائے اور بتائے جارہے ہیں ان میں 60 فیصد کا انحصار براہِ راست زراعت پر ہوگا اور یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے کہ ملک میں زرعی پیداواری صلاحیت بے انتہا ہے مگر یہاں بھی حکومت کی طرف سے مسلسل نظرانداز کرنے کی وجہ سے یہ شعبہ بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا ہوا ہے۔ حکومتی توقعات کو پورا کرنے کے لیے اس شعبے میں پیداواریت کو 70 فیصد تک بڑھانا ہوگا جس کے لیے اس شعبے میں بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت ہے جس کی گنجائش بہت ہی کم دکھائی دیتی ہے۔گندم پاکستان کی سب سے اہم فصل ہے جس کا قومی پیداوار میں حصہ 3 فیصد ہے۔قومی اوسط پیداوار فی ہیکٹر تقریباً 2.7 ٹن ہے جبکہ فی ہیکٹر پیداوار مصر میں 6.44 ٹن اور فرانس، جرمنی میں 7 ٹن سے زائد ہے۔اسی طرح دوسری بڑی فصل کپاس ہے جس کا مجموعی پیداوار میں حصہ 2 فیصد ہے اوراس فصل نے اس دفعہ بھی انتہائی مشکل وقت میں ملکی معیشت کو کافی سہارا دیا تھا۔پاکستان روئی پیدا کرنے والا دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے مگر پیداواری صلاحیت کے استعمال کے اعتبار سے یہ دسویں نمبر پر ہے۔چاول ہر سال تقریبا 6.5 ملین ٹن پیدا ہوتا ہے۔امریکہ میں چاول فی ہیکٹر 7.4 ٹن ،چین میں 6.57 ٹن جبکہ پاکستان میں فی ہیکٹر 1.7 ٹن پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح مکئی جو فرانس میں 8.2 ٹن فی ہیکٹر پیدا ہوتی ہے یہاں اس کی پیداوار فی ہیکٹر 1.7 ٹن ہے۔گنا مصر میں فی ہیکٹر 120 ٹن جبکہ یہاں سندھ میں 60 اور پنجاب میں 40 ٹن فی ہیکٹر پیدا ہوتا ہے۔یوں زراعت کے شعبے میں پیداوار میں 70 فیصد سے زیادہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔مگر پہلے ہی بہت ساری پیداوار پہلے مرحلے میں برآمد کنندگان کے اور پھر درآمد کنندگان کی لوٹ مار کی ہوس کی وجہ سے آبادی کی ضروریات کے لیے استعمال نہیں ہو پاتی اور ہر سال چینی اور گندم کی قلت کے بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کی ایک اور واضح مثال گنے کی حالیہ فصل کی ریکارڈ پیداوار ہے مگر اس کے باوجود آڑھتیوں اور بڑے ذخیرہ اندوزوں اور صنعتکاروں کی ملی بھگت کے ذریعے گنے کی قیمتیں انتہائی کم ترسطح، کسانوں اور چھوٹے زمینداروں کی پیداواری لاگت سے بھی کم رکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے جنوبی پنجاب اور شمالی سندھ میں سینکڑوں ٹن گنا شوگر ملوں کے باہر پڑا سوکھ رہا ہے۔اس

سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زراعت کے شعبے میں بھی محنت کشوں کی حالتِ زار پیداوار میں اضافے کے باوجود دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی ہے۔آئندہ برسوں میں زراعت کے شعبے میں شرح نمو کو ایک اور بڑا خطرہ پانی کی کمی سے لاحق ہوسکتا ہے۔پانی کے شعبے میں بڑے پیمانے کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔یا تو زراعت سے منسلک بڑی آبادی کو خشک سالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا پھر دوسری طرف سیلاب سے بڑے پیمانے کی تباہکاری برداشت کرنی پڑتی ہے۔پاکستان میں 1951ء میں 5000 کیوبک فٹ فی کس پانی موجود تھا اور آج محض ایک ہزار کیوبک فٹ فی کس رہ گیا ہے اور آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے اور دوسری طرف منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے زراعت کے شعبے میں 80 فیصد سے زائد پانی ضائع ہو جاتا ہے۔اسی طرح پینے کے پانی کی مقدار اور معیار بھی مسلسل گرتا جارہا ہے۔سینی ٹیشن کی خراب ترین صورتحال کی وجہ سے 60 فیصد سے زائد آبادی مضرِ صحت پانی پینے پر مجبور ہے۔

اس تمام تر معاشی خستہ حالی کا بوجھ پھر عوام پر لادا جاتا ہے۔عوام کا نہ صرف معیارِ زندگی مسلسل گر رہا ہے بلکہ غربت اور مہنگائی دنیا کی بلند ترین سطح پر پہنچ رہی ہے۔حکومت بڑے عوامی دباؤ کے پیشِ نظر غربت کے اصل اعداد و شمار ظاہر کرنے سے گریز کر رہی ہے۔بلکہ UNDP اور پلاننگ کمیشن کے تعاون سے چلنے والا مشترکہ سنٹر فار پاورٹی ریڈیکشن ہی بند کر دیا گیا ہے۔لیکن غیر سرکاری ذرائع کے مطابق روزانہ پاکستان میں 38000 لوگ غربت کی لکیر سے نیچے گر جاتے ہیں۔

10 جنوری کو BBC اردو ڈاٹ کام پر شائع ہونے والی آغا خان یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام قومی سروے برائے نیوٹریشن کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 30 فیصد گھرانے غذائی قلت کا شکار ہو چکے ہیں جبکہ سندھ میں صورتحال اور بھی زیادہ تشویشناک ہے جہاں 70 فیصد گھرانوں کو مطلوبہ خوراک دستیاب نہیں ہے۔50 فیصد بچے غذائی کمی کا شکار ہیں یعنی ان کا قد اور وزن اپنی عمر کے مطابق بہت کم ہے۔ان میں خون اور وٹامن اے اور ڈی کی کمی ہے اور ان کی ماؤں میں زنک کی کمی ہے۔اسی طرح صحت آبادی کی اکثریت کے لیے ایک سہانا خواب بن چکی ہے

جسے وہ اس خونی نظام میں کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔80 فیصد بیماریوں کی اصل وجہ غربت ہے۔ایسے لوگوں کی تعداد دس فیصد ہی مشکل سے ہوگی جنہیں کوئی بیماری نہیں۔نصف کے قریب آبادی تو پیچیدہ قسم کے ذہنی اور نفسیاتی مسائل میں مبتلا ہے۔پینے کے صاف پانی کی عدم دستیابی بھی بہت سی بیماریوں کا باعث بن رہی ہے جن میں ہیپاٹائیٹس سرِفہرست ہے۔پولیو کے پھیلنے کی رفتار پاکستان میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔2011ء کے پہلے 9 ماہ میں صرف سندھ میں ٹی بی کے 41000 مریض رپورٹ کیے گئے ہیں۔دل کے مرض میں تیزی سے اضافہ ہورہا جس کی ایک بڑی وجہ ہائپرٹینشن ہے جس کی جڑیں پھر غربت اور معاشی مسائل میں پیوست ہیں۔دل کی بیماریوں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد 5 لاکھ سالانہ سے زیادہ ہے اور دس سے بارہ لاکھ سالانہ نئے مریض رپورٹ کیے جارہے ہیں۔خون کی بیماریاں بہت تیزی سے پھیل رہی ہیں جن میں ہیموفیلیا اور تھیلیسیمیا سرِفہرست ہیں۔ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں 7 فیصد لوگ ان بیماریوں کا شکار ہیں جبکہ 30 فیصد میں ان کے جراثیم موجود ہیں۔80 فیصد لوگ غیر سائنسی علاج کراتے ہیں جس کی وجہ سے ملیریا اور ہیضہ جیسی معمولی بیماریاں بھی لوگوں کو موت کی نیند سلا رہی ہیں اور حکمران طبقات کی اس طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے۔بلکہ اس کیفیت میں بھی جعلی ادویات کا کاروبار عروج پر ہے۔ایک سال پہلے کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 30 فیصد سے زیادہ ادویات جعلی فروخت ہو رہی ہیں۔روزانہ جعلی ادویات سے مرنے والے مریضوں کی خبریں معمول کی بات بنتی جارہی ہیں۔

تعلیم کے شعبے کی حالت اس سے بھی زیادہ دگرگوں ہے۔2011ء لیگیتم پراسپیریٹی انڈیکس کے مطابق سنٹرل افریقن ریپبلک، مالی، سوڈان، ایتھوپیا اور نائیجیریا یہ پانچ ممالک ہی ایسے ہیں جن میں تعلیم کی حالت پاکستان سے زیادہ خراب ہے۔ایجوکیشن ایمرجنسی کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اس وقت پاکستان میں 70 لاکھ بچے پرائمری تعلیم سے محروم ہیں۔سیکنڈری سکولوں میں داخلے صرف 23 فیصد ہیں۔5 فیصد پاکستانی یونیورسٹی تک جاپاتے ہیں۔ڈھائی کروڑ بچوں کو تعلیم کا بنیادی حق میسر نہیں ہے۔تعلیم کا معیار یہ ہے کہ دیہی سکولوں کے 50 فیصد بچے ایک

جملہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔صرف 35 فیصد بچے کوئی کہانی پڑھ سکتے ہیں۔25 فیصد بچوں کو سکول کا پتہ ہی نہیں۔خواتین میں صورتحال اور بھی تشویشناک ہے۔60 فیصد مائیں بالکل ان پڑھ ہیں۔بعض دیہی علاقوں میں حالات اس سے بھی زیادہ برے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے ادارے FAO کی رپورٹ 'ایشیا پیسیفک سچوایشن اپ ڈیٹ' کے مطابق خوراک کی قیمتوں میں سب سے زیادہ اضافہ ایشیا میں پاکستان میں ہوا جو 20 فیصد تھا۔دسمبر 2011ء کے آخری ہفتے میں حساس اشیا کے انڈیکس کے مطابق اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں 12.23 فیصد،ملبوسات اور جوتوں میں 15 فیصد، ہاؤسنگ و یوٹیلیٹی خدمات میں 7.76 فیصد، صحت 11.4 فیصد،ٹرانسپورٹ 14.13 فیصد،تعلیم 12.93 فیصد،ریسٹورنٹ 17.14 فیصد اور دیگر سیکٹرز میں 21 فی صد اضافہ ہوا۔گزشتہ سال کی نسبت رواں مالی سال کے پہلے 6 ماہ میں گھی کی قیمت میں 25 فیصد،خوردنی تیل 24.33 فیصد، دودھ کی مصنوعات 21.24 فیصد،تازہ دودھ 20.85 فیصد (حالانکہ پاکستان دودھ پیدا کرنے والا دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے)، چاول 20.75 فیصد اور پیٹرول کی قیمت میں 20.15 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔سال کے اختتام کے ساتھ نئے سال میں بھی بنیادی اشیا کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان موجود ہے اور 1.45 فیصد اضافہ صرف پہلے ہفتے میں ہوا ہے۔گیس چارجز میں 14 فی صد، پیاز 27 فی صد، ایل پی جی 8 فی صد، انڈے کی قیمت 113 روپے درجن ہوگئی ہے۔حساس قیمتوں کا اعشاریہ (SPI) جو گزشتہ برس کے آخری ہفتے میں 175.83 تھا اس سال کے پہلے ہفتے میں 178.38 ہو گیا ہے۔ایک سال قبل اسی مدت میں یہ 168.16 تھا۔پٹرول 95 روپے لیٹر تک جا پہنچا ہے۔

روزگار کے مسلسل گرتے ہوئے مواقعوں اور مہنگائی کی اس شرح میں لوگوں کے پاس خودکشیوں یا جرائم کے علاوہ کوئی دوسری آپشن نہیں بچتی۔سب سے زیادہ شرح سے پھلنے پھولنے والے پیشے بھیک مانگنا اور جسم فروشی ہیں اور ان شعبوں میں اب نسل درنسل چلے آنے والے لوگوں کے علاوہ نوآموز لوگوں اور بالخصوص بچوں اور بچیوں کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ غلط نہ ہوگا کہ ان شعبوں میں مسابقت اور رقابت بڑھ رہی ہے۔کسی بھی

ٹریفک سگنل پر گاڑیوں میں بھیک مانگنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اب یہ کاروبار باقاعدہ ایک مافیا کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کو بڑے سیاستدانوں اور طاقتور لوگوں کے ایجنٹس کنٹرول کرتے ہیں جنہوں نے مخصوص علاقے آپس میں تقسیم کیے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بھیک مانگنے والوں سے بھی غنڈہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بچوں اور بچیوں دونوں میں جسم فروشی کی شرح کئی گنا بڑھ گئی ہے اور اب یہ چکلے شہروں اور مضافات کے مخصوص علاقوں سے نکل کر گلی محلوں اور شاہراہوں کا رخ کر چکے ہیں۔ اگر آج ساحر لدھیانوی زندہ ہوتا تو شاید اس کے قلم سے سیاہی کی جگہ خون ہی رواں ہو جاتا۔ مگر قومی غیرت اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے شور و غل کرنے اور ٹسوے بہانے والے لوگ ان مسائل اور ان کی اصل وجوہات پر بات کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں اور وہ ہو بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ یہ شرفا ہی تو اس کارِ خیر سے سب سے زیادہ استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ یہی دراصل اس طبقاتی نظام کی اصل مساوات ہوتی ہے کہ محنت کش عوام کے لیے زندگی جتنی مہنگی ہوتی چلی جاتی ہے حکمران طبقات کے لیے عیاشیاں اتنی ہی سستی ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی اپنی کتاب 'پاکستان و امریکہ تعلقات، دہشت گردی، سیاست و معیشت' میں لکھتے ہیں کہ ''گزشتہ دس برسوں میں غریب سے امیر طبقے کو 11000 ارب روپے منتقل ہوئے ہیں۔ ساڑھے تین برسوں میں دو کروڑ ستر لاکھ افراد مزید غربت کی لکیر سے نیچے چلے گئے ہیں۔ دس کروڑ پاکستانیوں کو دو وقت کی روٹی اور 14 کروڑ پاکستانیوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔''

حکمران طبقے کی عیاشیوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں نجی طیارے رکھنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وزارتِ دفاع کے اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ مالی سال کے دوران رحیم یار خان ایئرپورٹ سے 27، موہنجو دڑو سے 2، بہاولپور سے 10، سکھر سے 9، والنبدین سے 4 اور نوابشاہ سے 1 بین الاقوامی نجی طیارے کی پرواز آپریٹ ہوئی ہے۔ یہ کہانی الگ ہے کہ ان پر کسی قسم کا کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا گیا۔

اس معاشی صورتحال میں 2012ء کے لیے معیشت اور سیاست کا تناظر بھیانک سے بدترین کی طرف سفر کا ہے۔شاہد جاوید برکی 2 جنوری کے ڈان میں صورتحال کو کچھ ان الفاظ میں تجزیہ کرتے ہیں کہ ’’گزشتہ مالی سال کی بدترین کارکردگی کے پیشِ نظر 2012ء میں اس سے بہتر کارکردگی کی توقع نہیں کی جاسکتی، گزشتہ برس شرحِ نموصرف 2.4 فی صد تھا جبکہ آبادی میں اضافہ 2 فی صد تھا جس کے مقابلے میں معاشی نمو نہ ہونے کے برابر ہے۔یعنی فی کس آمدن میں 0.4 فی صد اضافہ ہوا جو تنخواہ دار طبقے کے لیے قابلِ رحم ہے۔۔۔۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ معیشت کی بری کارکردگی 2012ء میں بھی جاری رہے گی۔فی کس آمدن میں 0.5 فیصد اضافہ ہوگا اور ایک کروڑ مزید لوگ غربت کی لکیر سے نیچے گر جائیں گے۔بیروزگاری کی شرح میں اضافہ ہوگا۔امیر لوگ غربت کی اس دلدل کے وسط میں خوشحال جزیرے کی تعمیر جاری رکھیں گے اور جہاں تک تاریخ کو ہم جانتے ہیں یہ سماجی اور سیاسی دھماکوں کے لیے بہترین نسخہ ہوگا۔میں 2012ء میں پاکستان کے لیے کسی آسان وقت کی پیش بینی نہیں کرسکتا۔‘‘

حکمران طبقات کے اپنے تجزیہ نگار اپنے طبقات کی کارکردگی سے یکسر مایوس اور بدگمان ہو چکے ہیں اور واقعتاً اس نظام میں کسی بھی قسم کی بہتری کی گنجائش ناپید ہو چکی ہے۔مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ لوگ اس سماجی ذلت اور غلاظت کو یونہی برداشت کرتے رہیں گے۔اسی سماجی ذلت کی کوکھ میں عوامی بغاوت کا طوفان پل رہا ہے جو جلد یا بدیر جنم لے گا اور اس نظام کی باقیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔

قوم پرستی کا آسیب اور بنیاد پرستی کا ناسور

جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے، ان کو
ہمتِ کفر ملے، جراتِ تحقیق ملے
فیض احمد فیضؔ

65 سال گزر جانے کے بعد بھی آج مملکتِ خداداد شدید ترین تشخص کے بحران سے گزر رہا ہے۔ مردار نظریہ پاکستان کا تعفن تنفس کو اور بھی اذیتناک بنا رہا ہے۔ قیادتوں کی غداریوں اور تذبذب کی وجہ سے ایک زندہ ثقافت کو دولخت کرنے کے بعد اور 27 لاکھ معصوموں کے خون کی آبیاری سے پاکستان تو وجود میں آ ہی گیا تھا مگر پاکستانی قوم آج تک معرضِ وجود میں نہیں آ سکی۔ مختلف قومیتوں کے حکمران طبقات کی زیادہ لوٹ مار کے لیے ایک باطل اکٹھ سے تشکیل پانے والا حکمران طبقہ اپنے سامراجی آقاؤں کی دلالی اور اپنے محنت کشوں کے گھناؤنے استحصال کے ذریعے اپنی دولت اور اثاثوں میں تو بے پناہ اضافہ کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر غریب عوام کا کوئی ایک مسئلہ بھی حل کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ بلوچستان سے لے کر کشمیر تک ہر جگہ قومی محرومی میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ اپنے تاریخی ضعف، مالیاتی انحصار اور سیاسی عدم تحفظ کی وجہ سے یہ حکمران قومی مسئلے کو حل کرنے کی بجائے دیگر کئی علاقوں اور قومیتوں کو اس تعصب اور نفرت کے صحرا میں گھسیٹ کر اسے اور زیادہ مشتعل کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں تا کہ حقیقی طبقاتی مسائل سے عوام کی توجہ ذیلی اور فروعی نان ایشوز کی طرف مبذول کرائی جا سکے اور جب ان کی بھڑکائی ہوئی یہ چنگاری اتنی بھڑکنے لگے کہ اس سے سارے نظام اور لوٹ مار کو ہی خطرات لاحق ہونے لگیں تو پھر شدید ریاستی جبر کے ذریعے اس پر قابو پا لیا جائے۔ مگر طبقاتی احساس اور تشخص محض کسی دانشور کے دماغ کی اختراع یا محنت کشوں کی نفسیاتی بیماری کا نام نہیں جسے دیگر نان ایشوز کے محلول

میں تحلیل کر کے زائل کیا جا سکے بلکہ یہ آبادی کی اکثریت کی زندگی کے روزمرہ کے مسائل اور مشکلات پر مبنی وہ ٹھوس حقیقت ہے جسے ایک طبقاتی نظام کی حدود وقیود میں رہتے ہوئے زائل یا تحلیل نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک طبقات رہیں گے طبقاتی کشمکش بھی موجود رہے گی۔

پاکستان میں قومی محرومی، جبر اور اس کے خلاف نفرت اور مزاحمت کی سب سے زیادہ سبق آموز اور متاثر کن صورتحال بلوچستان میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں پر آزادی کی نسل در نسل لڑی جانے والی جنگ کے باوجود اور بے مثال قربانیوں کی طویل فہرست کے ہوتے ہوئے آج قوم پرست بلوچ محنت کش عوام کے قریب آنے کی بجائے پہلے سے کئی گنا زیادہ فاصلے پر پہنچ گئے ہیں۔ قومی آزادی کی اس جدوجہد میں اب رائیگانی کا احساس تقویت پکڑ رہا ہے۔ بلوچستان کا شمار وسائل کے حوالے سے دنیا کے امیر ترین صوبوں اور خطوں میں کیا جاسکتا ہے جہاں پر تیل، گیس، سونے، تانبے اور کوئلے کے علاوہ دیگر بے شمار معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ دولت بلوچ عوام کی ضرورتوں کی تکمیل اور معیارِ زندگی میں بہتری کی بجائے ان کی بقا اور سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ یہی تو اس نظام کا گورکھ دھندا ہے جس میں لفظوں کے معانی اور محسوسات بدل دیئے جاتے ہیں۔ وسائل، مسائل اور دولت ذلت بن جاتی ہے۔

اسی بیش بہا دولت کے خزانے کی وجہ سے پوری دنیا کے حکمران طبقات کی مداخلت نے بلوچوں کی قومی محرومی، استحصال اور اس کے خلاف مزاحمت کو بہت زیادہ پر پیچ اور گنجھلک بنا دیا ہے۔ پھر بلوچستان کی جغرافیائی حیثیت بھی ان درندوں کی زیادہ دلچسپی اور جنونیت کا باعث بنی ہے۔ گوادر پورٹ اور دیگر معدنی وسائل کی تلاش اور استعمال کے ٹھیکوں اور معاہدوں کے گرد امریکی اور چینی سامراج کی پراکسی جنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی اور اس میں پاکستانی فوج، سیاست دانوں اور ایجنسیوں کے مختلف دھڑوں کی اپنے کمیشنوں اور معاوضوں کے لیے بھڑوت نے بلوچ غریب عوام کے زخموں پر مرچیں ڈال دی ہیں اور خود بلوچ حکمران طبقہ بھی اس سارے کھلواڑ سے مستفید ہو رہا ہے۔ جب ہزاروں بلوچ نوجوان لاپتہ ہیں، سینکڑوں کو اغوا کرلیا گیا ہے اور روزانہ درجنوں مسخ شدہ لاشیں ملتی ہیں تو اسی آگ اور خون کی ہولی کے بیچ میں بلوچ

حکمران طبقات دونوں ہاتھوں سے لوٹ کھسوٹ میں ملوث ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ بلوچستان کی اس انتہائی دگرگوں صورتحال کے باوجود مارچ میں ممکنہ سینیٹ کے انتخابات کے لیے جوڑ توڑ عروج پر ہے اور میڈیا رپورٹس کے مطابق بلوچستان میں سینیٹ کے ایک ووٹ کے لیے پانچ کروڑ تک کی پیشکشیں کی جارہی ہیں اور اس پر گفت وشنید جاری ہے اور انتخابات تک یہ نرخ مزید بڑھ سکتے ہیں۔بلوچ نوجوان اس سارے کھلواڑ کو محض تماشائیوں کی طرح نہیں دیکھ رہے بلکہ اس سے انتہائی اہم اسباق بھی سیکھ رہے ہیں۔ان انتہائی تکلیف دہ تجربات سے گزرنے کے بعد وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس غلیظ ،مکروہ اور درندہ صفت حکمران طبقے کی قیادت میں اگر انہیں آزادی مل بھی گئی تو ان کی آنے والی نسلوں کی زندگیاں بہتر ہونے کی بجائے مزید ناقابلِ برداشت ہو جائیں گی۔

ان گنت جانوں کے نذرانوں، بے لوث جذبوں کی بے مثال وارفتگی اور آزادی کی شمع کے پروانوں کی بے شمار قربانیوں کے باوجود مسلح جدوجہد میں ناگزیر طور پر قیادت کے منحرف ہو جانے یا آلہِ کار بننے کے امکانات جنم لیتے ہیں۔جوں جوں تھکاوٹ کی وجہ سے احساسِ شکست غالب آتا جاتا ہے توں توں سامراجیوں اور دیگر کھلاڑیوں کی مداخلت بھی بڑھتی جاتی ہے۔سوویت یونین کے ہوتے ہوئے سرد جنگ کے دنوں میں سٹالنسٹ بیوروکریسی نے اس تحریک کو یرغمال بنائے رکھا مگر اس کے بعد نظریات کا یہ خلا اور بھی شدت اختیار کر گیا جس کی وجہ سے امریکہ اور بھارت جیسے کھلاڑیوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ان کی مداخلت جتنی بڑھتی چلی جاتی ہے چین نواز ریاستی دھڑوں کا جبر بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس سب کا خمیازہ غریب اور معصوم عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔اس مزاحمت کو زیادہ تقسیم کرنے اور پھوٹ ڈلوانے کے لیے ریاستی ایجنسیاں خود مختلف قومیتوں کے لوگوں کے اغوا اور لوٹ مار میں ملوث ہیں۔گزشتہ برس بہت سے پنجابی محنت کشوں کے شناختی کارڈ چیک کر کے قتل کرنے کے واقعات پیش آئے جس سے ریاست کے اس تحریک کے طبقاتی لڑائی کی شکل اختیار کر جانے کے خوف کی غمازی بھی ہوتی ہے۔

مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آزادی کی اس جنگ میں سنجیدہ اور مخلص سپاہیوں کی کمی ہے

بلکہ ایسے سنجیدہ کارکن اب خود مسلح جدوجہد کی محدودیت اور مصنوعیت کے کردار کو بہت تیزی سے سمجھ رہے ہیں اور دوسری طرف خود بلوچ حکمران طبقات کا کردار بھی ان کے سامنے بالکل بے نقاب ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس جدوجہد کو نوجوانوں کے مختلف گروپس خود چلا رہے ہیں اور اس پر سے سرداروں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری تقریباً ختم ہو چکی ہے اور زیادہ تر سردار آئی ایس آئی کے ساتھ مصالحت کر کے اقتدار میں شراکت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ عطاء اللہ مینگل نے ایک ماہ قبل کہا تھا کہ بلوچ نوجوانوں کو اب یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا وہ ان طریقوں سے آزادی حاصل کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ ان کے اپنے اضطراب اور پشیمانی کا بہترین نمونہ ہے۔ بلوچ سرداروں اور جاگیرداروں کا اس قومی آزادی کی جنگ کی قیادت سے انخلا ایک اہم سنگِ میل ہے اور بلوچ نوجوانوں کی بڑی کامیابی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے تجربات سے یہ بھی سیکھ جائیں گے کہ نہ صرف بلوچ بلکہ دیگر قومیتوں اور دنیا بھر کے محنت کشوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی جنگ کے ذریعے ہی وہ حقیقی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ بلوچستان کا محنت کش طبقہ پہلے ہی مرک مار کر، محکمہ ڈاک، پیرا میڈیکل اور دیگر شعبوں میں ایک لڑائی میں ہے۔ ان کے شانہ بشانہ چل کر ہی بلوچ نوجوان اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ مارکس نے آئر لینڈ کی جدوجہدِ آزادی میں مسلح جدوجہد کی محدودیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی تھی ''کسی برطانوی درزی کی دوکان کو آگ لگا کر آئر لینڈ کو آزاد نہیں کروایا جا سکتا۔'' بلوچ سیاسی کارکن اپنے تجربے سے اسی سچائی تک پہنچ رہے ہیں۔ بلوچستان میں مارکسی لٹریچر بہت زیادہ پڑھا جا رہا ہے اور انہی عظیم نظریات کی بنا پر ایک ناقابلِ تسخیر انقلابی قوت ابھرے گی جو بلوچستان کو اس بربریت اور وحشت سے نکالنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

دوسری طرف اس پورے خطے کے اندر جنگی جنون اور وحشت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ محنت کشوں اور نوجوان نسل کے ایک انقلاب سے گھائل اور ایک ممکنہ انقلاب سے خوفزدہ ایرانی ریاست بھی خارجی محاذوں پر مزید جارحانہ پالیسیاں اپنانے پر مجبور ہو رہی ہے۔ خاص طور پر سعودی عرب کے ساتھ اس کے تعلقات میں کشیدگی کی لہر تیز ہوئی ہے اور سعودی عرب کی ریاست

بھی عرب انقلاب کے خوف سے زیادہ چڑچڑی ہو کر اس کشیدگی میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔اس کے اثرات ہم پہلے ہی بلوچستان میں شیعہ سنی فرقہ وارانہ قتل وغارت کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔بے شمار ہزارہ لوگوں کو قتل کیا جاچکا ہے اور آئی ایس آئی خود بلوچوں کی جدوجہد کو کند اور زائل کرنے کے لیے اس مذہبی جنونیت کو مشتعل کرنے کی پالیسی پر گامزن ہے جس کی وجہ سے پہلے سے خون میں نہلایا ہوا بلوچستان مختلف سامراجی طاقتوں کا میدانِ جنگ بنتا جا رہا ہے۔ایرانی ریاست بھی بلوچستان کی اس لوٹ مار کی لڑائی میں مداخلت کرنے کی کوششیں کر رہی ہے اور درحقیقت ایران میں مداخلت کرنے کی جوابی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں تو اس حوالے سے آنے والے دنوں میں اس سرحد پر بھی کشیدگی بڑھ سکتی ہے۔

سامراجی پاکستانی ریاست کو زیادہ مطیع کرنے کے لیے اپنے اثر و رسوخ کو سندھ تک پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔کراچی میں ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ سامراجی آشیرباد میں طاقت کے نشے سے چور اور مشرف دور میں مضبوط معاشی بنیادیں استوار کر لینے والی ایم کیو ایم کے پاکستان کے سب سے بڑے صنعتی شہر پر اثر و رسوخ کے خلاف ریاست کے امریکہ مخالف دھڑے نے ایک دفعہ پھر ان کو اپنے وجود کا احساس دلوانے کی کوشش کی اور ایک طویل خون خرابے کے بعد پورے نظام کو لاحق خطرے، سرمایہ کاری کے انخلا اور ریاست کی مکمل ناکامی کے تصور کو زائل کرنے کے لیے اس لڑائی میں کمی کی گئی ہے مگر اب بھی کمتر پیمانے پر ہی سہی لیکن آگ اور خون کا یہ کھیل جاری ہے۔گزشتہ برس ٹارگٹ کلنگ میں کراچی میں 1200 سے زیادہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔کراچی میں قومی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقریباً منی ریاستیں اور نوگو ایریاز بنا کر محنت کشوں میں شدید ترین خوف و ہراس کی فضا قائم کی گئی ہے۔حقیقی کے سربراہ آفاق کی رہائی کے بعد یہ اشتعال مزید بڑھے گا جس کا اظہار آئندہ انتخابات کو خون میں نہلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ایم کیو ایم کے مہاجر صوبے کے موقف کو آئی ایس آئی نے طاقت سے مسترد کر دیا تھا تو اب ایم کیو ایم لسانی بنیادوں پر صوبوں کے قیام کا ترمیمی بل قومی اسمبلی میں لے آئی ہے جس پر سندھی قوم پرستوں نے سندھ بھر میں ہڑتال کی کال دے کر شدید ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔

سامراجیوں نے سندھی قوم پرست تحریک میں بھی بلوچستان کے راستے سے رسائی حاصل کرنے اوراس کو مسلح کرنے کی کوشش کی تھی مگر سندھی قوم پرستوں پر آئی ایس آئی کی گرفت زیادہ مضبوط ہے اور مرحوم پیر پگاڑا کے بقول تمام سندھی قوم پرست آئی ایس آئی سے پیسے لیتے ہیں۔لیکن درحقیقت سندھی قوم پرست بھی اپنی سماجی حمایت بڑھانے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں اس لیے اقتداراور مراعات کے لیے ان کی بے صبری بڑھتی ہی جارہی ہے اور وہ اس بے صبری کی وجہ سے کبھی بھی وفاداریاں بدلنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔خاص طور پر سیلاب کے بعد ہونے والی بڑے پیمانے کی تباہی کے بعداور پیپلز پارٹی کی حکومت کی طرف سے متاثرین کی دادرسی میں ناکامی کے بعد عمومی طور پر یہ سوچا جارہا تھا کہ قوم پرست اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر کوئی بڑی قوت کے طور پر ابھر سکتے ہیں۔اوران کی ایک ہڑتال کی کال پر پیپلز پارٹی کی حکومت سے ناراض اور مایوس سندھی عوام نے بھر پور رسپانس بھی دیا مگر وہ قوم پرستوں سے محبت کا اظہار نہیں تھا بلکہ پیپلز پارٹی کی قیادت سے ایک مزید اور شدید پر شکوہ اپیل تھی کہ دیکھو ہماری محرومیاں اور ذلتیں تمہارے اقتدار میں کہاں پہنچ گئی ہیں اور تمہاری عیاشیاں بڑھتی ہی جارہی ہیں۔اسی کیفیت کا درست تجزیہ نہ کر سکنے اور غیر جدلیاتی نقطہ نظر رکھنے کی وجہ سے اوراپنے آپ کو زیادہ لچکدار اور ذہین ثابت کرنے کے لیے کچھ نام نہاد پیٹی بورژوا دانشوروں نے اس سے سندھ میں قوم پرستی کے نئے ابھار کا تناظر دیتے ہوئے طبقاتی نقطۂ نظر پر شدید تنقید شروع کر دی اور قوم پرستوں سے پیار کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔لیکن عملی طور پر قوم پرستوں کے پاس کوئی عوامی پروگرام موجود نہیں ہے اوران کی مخصوص تنگ نظر،فرقہ پرور ذہنی اپروچ کی وجہ سے وہ کوئی بڑی سماجی حمایت نہ تو حاصل کر سکے ہیں اور نہ آنے والے دنوں میں کر سکیں گے۔انتہائی انجینئر ڈ انتخابات میں شاید اسمبلی میں زیادہ ورائٹی اور رونق کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے منچلے ان میں سے چندایک کو وہاں تک لے جائیں لیکن عوامی سطح پر ان کی پذیرائی کا گراف کچھ زیادہ اونچا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سندھ میں قومی محرومی اوراستحصال سے انکار کر دیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سندھ کے وسائل کی لوٹ مار میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور پاکستان میں گزشتہ چار

برسوں میں سب سے زیادہ غربت اور بھوک بھی سندھ میں بڑھی ہے جس میں پنجابی سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ سندھ کے وڈیرے اور جاگیردار برابر کے مجرم ہیں اور سندھ میں اس وڈیرہ شاہی کے خاتمے اور زرعی انقلاب کے بغیر پانی سے لے کر روٹی تک کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا جو یہاں کے محنت کش ملک بھر کے صنعتی مزدوروں کی قیادت میں برپا کریں گے اور جو لوگ اس وڈیرہ شاہی کو سندھ کی ثقافت قرار دے کر اس کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ سندھی عوام کے سب سے بڑے غدار ہیں اور جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر وہ سندھ کی ثقافت دیکھنا چاہتے ہیں تو موہنجوداڑو میں جا کر دیکھ لیں جو ایک غیر طبقاتی اور اشترا کی ثقافت ہے اور جس تاریخ کو یہاں کے محنت کش بلند پیمانے پر ایک دفعہ پھر دہرائیں گے۔

پشتونوں کی قوم پرست قیادت نے جتنی بڑی غداری کی ہے اس کی شاید تاریخ میں کوئی مثال نہ ملے۔انہوں نے بلاشبہ نظریات کو تھوک میں بھی نہیں بلکہ پرچون میں بیچا ہے اور ضمیر فروشی اور کاسہ لیسی کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔صوبے کو پشتونخواہ کا نام دلوا کر بغلیں بجانے والوں کی ڈرون حملوں میں پشتونوں کی نسل کشی پر مجرمانہ خاموشی نے انہیں عوام کے سامنے ننگا کر دیا ہے۔ایک طرف تو پشتونوں پر مذہبی جنونیت مسلط کی گئی اور دوسری طرف غربت اور مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ دی ہے۔دوسری طرف اس مخلوط حکومت میں عوامی نیشنل پارٹی نے لوٹ مار کی انتہا کر دی ہے۔جس کی وجہ سے پشتون عوام کی سیاسی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور پیپلز پارٹی کے بھی حکومت میں ہونے کی وجہ سے اس سیاسی بے چینی کے پاس کوئی واضح متبادل اور لائحہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے اے این پی کے اندر آنے والے دنوں میں ٹوٹ پھوٹ اور انتشار جنم لے سکتا ہے۔پہلے ہی خاص طور پر طلبا اور یوتھ ونگ میں ایک پھوٹ کی کیفیت موجود ہے۔پارٹی کے سنجیدہ اور مخلص کارکنان میں دوبارہ نظریاتی بحثوں کا آغاز ہو رہا ہے اور متبادل کی جستجو سلگ رہی ہے۔ دوسری طرف افغانستان میں بھی امریکی فوج کو شکست کے ساتھ ساتھ دوبارہ انقلابی قوتیں اپنے آپ کو منظم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔امریکہ اور پاکستانی ریاست کے مابین کشیدگی میں پشتون قوم پرستوں کا کاسہ لیسی کا کردار اور بھی کھل کر سامنے آ رہا ہے۔مزید یہ کہ عالمی میڈیا کے شدید

ترین پراپیگنڈے کے باوجود یہ خطہ بنیاد پرست نہیں ہے بلکہ یہاں کے لوگ ہمیشہ سیکولر قوتوں کی سیاسی حمایت کرتے رہے ہیں۔جو نام نہاد لبرل اور بائیں بازو کے دانشور یہ شور مچاتے ہیں کہ امریکہ کے جانے کے بعد نہ صرف افغانستان میں پھر طالبان اقتدار میں آجائیں گی اور بڑی تباہی ہوگی بلکہ پشتونخواہ کے ذریعے پاکستان میں بھی ملاں اقتدار پر قابض ہوسکتے ہیں وہ دراصل امریکی سامراج کی دلالی کا کردار ادا کررہے ہیں اور صورتحال اس کے بالکل برعکس ہوسکتی ہے۔پہلے تو یہ کہ امریکہ کی موجودگی میں کونسا امن ہوگیا ہے جو اس کے جانے کے بعد برباد ہو جائے گا۔ انسانیت کی اس سے زیادہ تذلیل اور انسانی خون کی اس سے زیادہ ارزانی اور کیا ہوسکتی ہے۔دوسرا یہ کہ ان خوفزدہ دانشوروں کے تجزیوں کے بالکل برعکس امریکہ کی شکست سے ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف غریب عوام کے حوصلوں کو نئی توانائی اور شکتی مل سکتی ہے۔اس شکست میں میڈیا کے پروپیگنڈے کے برعکس طالبان کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔وقتی طور پر ممکن ہے کہ طالبان رجعتی پاکستانی ریاست اور امریکی سامراج کے کچھ دھڑوں کی معاونت سے اقتدار پر قابض ہو جائیں لیکن بہت جلد انہیں ایک عوامی بغاوت کا سامنا کرنا پڑے گا جس کے پورے خطے میں انقلابی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔یہی افغان اور پشتون جن کو بنیاد پرست اور جاہل کہہ کر گالی دی جاتی ہے یہ ثور انقلاب کی عظیم روایات کے وارث ہیں اور یہ ان روایات کو بلند پیمانے پر دوبارہ دوہرا کر ڈیورنڈ لائن کا خاتمہ کرکے ایک سوشلسٹ جمہوریہ کے قیام کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔

کشمیر کے مسئلے کو بھی آج کل حکمران طبقات نے کافی دبایا ہوا ہے اور نظریہ ضرورت کے تحت آجکل اس کو زیادہ اچھالا نہیں جارہا۔لیکن پاکستانی اور انڈین دونوں ریاستوں کا سیاسی بحران پھر ان کو کشمیر کے مسئلے پر ایک جنونی موقف لینے پر اکسا سکتا ہے۔انڈین مقبوضہ کشمیر میں ماضی قریب میں بڑی تحریک رہی ہے جو قومی سے زیادہ طبقاتی کردار کی حامل تھی۔پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں بھی حالیہ انتخابات میں کشمیری عوام نے قوم پرستوں کو یکسر مسترد کردیا ہے اور ان کو عبرت ناک شکست سے ہمکنار ہونا پڑا ہے۔یہ قوم پرست بھی اب دونوں طرف کی ایجنسیوں کی دلالی کرکے بالکل کھوکھلے ہوچکے ہیں اور ان کے دوسری طرف کے نظریاتی ساتھیوں کا بھی یہی حال ہے۔یوں سرحد

کے اس پار اور اس پار کی جدوجہد کو جوڑ کر ایک انقلابی بغاوت کے لیے راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔ گویا آج کے حالات نے افغانستان، بھارت اور پاکستان کے مستقبل کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور یوں اس خطے کے عوام کی نجات صرف اور صرف ایک سوشلسٹ فیڈریشن میں ہی مضمر ہے۔

آج کل صوبوں کا بھی بہت شور ہے۔ اگرچہ سرائیکی عوام میں صوبے کے لیے کوئی سنجیدہ تحریک موجود نہیں ہے مگر حکمران اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اس بحث کو اچھال رہے ہیں۔ ایم کیو ایم خاص طور پر اس کے گرد شور مچا رہی ہے کیونکہ اس کے پاس سیاست کرنے کے لیے کوئی اور سنجیدہ ایشو ہے بھی نہیں۔ اب وہ آئی ایس آئی کے دباؤ میں جہاں براہِ راست مہاجر صوبے کا مطالبہ نہیں کر سکتے تو لسانی بنیادوں پر صوبوں کا مطالبہ کر کے اپنے موقف پر آئندہ کے لیے سیاسی گراؤنڈ اور حمایت حاصل کرنے کوشش کر رہے ہیں۔ جبکہ ہزارہ صوبے کی حمایت اس لیے بھی کر رہے ہیں کیونکہ کراچی میں بھی ہزارہ کمیونٹی کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور ہزارہ قومی موومنٹ کی معاونت سے کراچی میں بھتہ خوری کی لڑائی اور انتخابی معرکے میں وہ اسے اے این پی کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان جھوٹی تحریکوں میں ان چھوٹی اور پسماندہ قومیتوں کا حکمران طبقہ اپنے عوام کے سامنے بری طرح بے نقاب ہو رہا ہے۔ فاٹا میں بھی صوبے کے لیے ایک جعلی تحریک بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سامراجی قتل و غارت اور محرومی اور لاعلاجی میں سسکنے والی اور بنیاد پرستی کے زخموں سے گھائل اس عوام کے ساتھ اس سے بیہودہ مذاق اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن وہاں کے سرداروں اور حکمرانوں کی لوٹ مار کا عالم یہ ہے کہ ممکنہ سینیٹ کے انتخابات کے لیے دنیا ٹی وی چینل کی مخبریوں کے مطابق ایک ووٹ کا ریٹ 25 کروڑ روپے لگایا جا رہا ہے اور فاٹا میں چار قومی اسمبلی ممبران پر ایک سینیٹر منتخب ہوتا ہے یوں ایک ارب روپے دے کر سینیٹر بننے والے آدمی کے لیے اس سے کئی ارب کمانے سے زیادہ بڑا مقصد اور کیا ہو سکتا ہے اور اس کیفیت میں اسے بھلا کیا سروکار ہو گا کہ وہاں کے لوگ بھوک سے مرتے ہیں یا سامراجی بمباری سے۔ تاہم اگر سرائیکی، ہزارہ اور فاٹا صوبے بنا بھی دیئے جاتے ہیں تو اس سے عوام کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکے گا کیونکہ اس معیشت میں اتنی گنجائش ہی نہیں کہ کوئی بڑا انتظامی یا سوشل

انفراسٹرکچر تعمیر کیا جا سکے۔

لیکن اگر سرائیکی صوبہ بنایا جاتا ہے تو تقسیم در تقسیم کی پالیسی کے تحت آنے والے دنوں میں سندھ میں بھی مہاجر اور سرائیکی بنیادوں پر ایک شدید تضاد کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جائے گی۔خاص طور پر پیپلز پارٹی کی مقبولیت کے گراف میں کمی اور داخلی انتشار کی صورت میں ایم کیو ایم کی مداخلت کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔امریکہ پہلے سے ہی جنوبی پنجاب میں طالبانائزیشن کے پروپیگنڈے کے ذریعے فوجی آپریشن کا مطالبہ کرتا رہا ہے ۔حالانکہ جنوبی پنجاب کا بنیاد پرستی کی طرف جھکاؤ یا امکان کا انتہائی غلط تاثر دیا جاتا ہے۔یہ درست ہے کہ یہاں پر بہت زیادہ مدرسے ہیں جہاں پر ریاستی سرپرستی میں مذہبی جنونیت کی تعلیم دی جاتی ہے اور بچوں اور بچیوں کی ایک بڑی تعداد ان مدارس میں مقیم اور زیرِ تعلیم ہے جس کی وجہ بڑے پیمانے کی غربت ہے اور ان مدرسوں میں مفت تعلیم اور رہائش کی سہولت موجود ہے۔لیکن ان مدارس اور علما کا کردار بھی لوگوں کے سامنے بے نقاب ہوا ہے اور یہ مدارس جہاں ایک طرف دہشت گردی کے گڑھ سمجھے جاتے ہیں وہیں جسم فروشی کی ساری صنعت کے روحِ رواں بھی ہیں اور یہ بات اور قصے زباں زدِ عام ہیں۔اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی شور شرابا بڑھنے کے باوجود دراصل ان کی حمایت مسلسل گر رہی ہے اور سرائیکی قوم ہمیشہ پر امن اور سیکولر رجحان کی حامل رہی ہے جس کا اظہار ماضی میں بڑے پیمانے پر پیپلز پارٹی کی حمایت سے کیا جا سکتا ہے۔حتیٰ کہ یہاں کے لوگ قوم پرستوں کو بھی شر پسند کہہ کر مسترد کرتے رہے ہیں۔یہاں کی مخصوص ثقافت بھی سندھ کی طرح یہاں بنیاد پرستی کی بڑی سماجی حمایت کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔لیکن اب یہاں بڑے پیمانے پر بدامنی اور انتشار پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ہم نئے صوبے بنانے کی مخالفت نہیں کرتے لیکن اس کے پیچھے کارفرما عوامل کو چھپانا اور ریاستی عزائم کو بے نقاب نہ کرنا بھی ایک بڑا سیاسی جرم ہوگا۔صوبہ بنانے سے جہاں انتظامی مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھیں گے وہیں سیاسی افراتفری اور بدامنی میں بھی اضافہ ہی ہوگا۔

تاہم ڈوبتی ہوئی معیشت کے ساتھ قومی مسئلہ مزید بھڑکے گا اگر ایک انقلابی لینن اسٹ

پالیسی نہ اپنائی گئی تو حکمران طبقات قومی سوال کو اس طبقاتی اور قومی جبر کے نظام کا تختہ الٹ دینے والی تحریکوں میں طبقاتی جڑت کو توڑنے کے لیے استعمال کریں گے۔عوام کے حالات میں مزید گراوٹ آئے گی۔ دولت کی منصفانہ تقسیم، ملکیتی رشتوں کی تبدیلی، ذرائع پیداوار، معیشت، زراعت اور معدنی وسائل پر محنت کش طبقے کی اجتماعی ملکیت کے بغیر، موجودہ نظام میں کوئی بھی انتظامی تبدیلی عوام کی اذیت کو کم نہیں کر سکتی۔سماج کے زندہ جسم کو عذاب اور تکلیف دینے والے سرمایہ دارانہ نظام کے سرطان کو جراحی سے ٹھیک کرنا ہوگا۔اس کامیابی کو حاصل کرنے کا واحد راستہ ایک سوشلسٹ انقلاب ہے۔

حالیہ تاریخ میں بلاشبہ ''عرب بہار'' کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔عرب انقلاب مختلف پیچیدگیوں اور پسپائیوں سے ہوتا ہوا آج بھی جاری ہے اور مظلوم عوام کی بے مثال جدوجہد مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔خاص طور پر مصر میں اخوان المسلمین کی حکومت بننے کے بعد بہت سے لوگ اسے انقلاب کی فیصلہ کن شکست قرار دے رہے تھے مگر اس کے بعد تحریر سکوائر پھر انقلاب کی ایک نئی اٹھان کا منظر پیش کر رہا ہے۔مصر میں اخوان المسلمین کی سامراجی پشت پناہی کے نتیجے میں فتح سے خطے میں بنیاد پرست قوتوں میں سیاسی ہلچل کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے۔لیکن اخوان المسلمین کے حکومت سے قبل اور بعد امریکیوں کے ساتھ تسلی بخش مذاکرات سے ایک دفعہ پھر ثابت ہو گیا کہ بنیاد پرستی سامراجیت کا بہترین آلہ کار ہے اور اس خطے میں امریکہ مخالفت کا ناٹک کرنے والی تمام اسلامی قوتیں درحقیقت امریکی آشیرباد سے ہی اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔اخوان المسلمین کی موجودہ حکومت کے امریکہ کے ساتھ تمام معاشی اور سیاسی معاملات اقتدار کی منتقلی سے پہلے ہی طے پا گئے تھے۔پاکستان کی بنیاد پرست تنظیموں نے بھی دوبارہ سے ایک اتحاد بنا کر امریکی امداد کے ذریعے آئندہ اقتدار میں ایک بڑے حصے کے لیے پر تولنا شروع کر دیا ہے۔باہمی تضادات کے باوجود پاکستانی ریاست اور امریکی پالیسی ساز اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی قسم کی ممکنہ بغاوت کو زائل کرنے کے لیے بنیاد پرستی سے زیادہ بہتر ہتھیار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ایک طرف ملک بھر میں رجعتی طاقتوں کے جلسے منعقد کروائے جا رہے ہیں

جن میں گوامریکہ گو کے فلک شگاف نعرے لگائے جاتے ہیں تو دوسری طرف امریکہ بھی ان مذہبی قوتوں کے ساتھ مذاکرات اور گفت وشنید میں مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ دوبارہ سے اپنا اثر ورسوخ بحال کیا جا سکے۔اس حوالے سے ہمیشہ کی طرح اسے سعودی عرب کی خدمات بھی دستیاب ہیں۔ 27 جنوری کو کراچی میں مولانا فضل الرحمان کا 'اسلام زندہ باد' جلسہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔وکی لیکس کے مطابق مولانا پہلے بھی وزارتِ عظمیٰ کا امیدوار رہا ہے اور اب اسے اخوان المسلمین کے اقتدار کے بعد پھر ایک توانائی ملی ہے اور وہ پھر اقتدار میں بڑے حصے کے خواب دیکھ رہا ہے۔وہ جلسے میں بھی بار بار چلاتا رہا کہ اگر مصر میں تبدیلی آ سکتی ہے تو یہاں کیوں نہیں آ سکتی۔مگر نئی ایم ایم اے کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ جماعتِ اسلامی اور فضل الرحمان کا عہدوں کی تقسیم کے اوپر اختلاف ہے۔اس سے پہلے ہم خود جماعتِ اسلامی کے اندر بھی کافی عرصے سے ایک پھوٹ کی کیفیت دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیفیت ابھی تک نہ صرف موجود ہے بلکہ شدت اختیار کر رہی ہے۔اس کی عکاسی سابق امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے دو کالموں میں ہوتی ہے جن میں موصوف نے نہ صرف سیکولر قوتوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ خود د جماعتِ اسلامی اور دیگر مذہبی جماعتوں کے کردار پر بھی جملے کسے اور ان کا کہنا تھا کہ اگر مذہبی قوتیں مناسب کردار ادا کریں اور اپنے اختلافات کو نظر انداز کر دیں تو مصر کی طرح یہاں بھی ایک اسلامی حکومت بنائی جا سکتی ہے۔تاہم ان کے داخلی تضادات تو موجود ہیں لیکن چونکہ یہ کوئی اصولی اور نظریاتی اختلاف نہیں ہے اس لیے آئندہ پھر ایک متحدہ مجلسِ عمل بننے کے عمل کو رد نہیں کیا جا سکتا۔مذکورہ جلسے میں فضل الرحمان نے کافی حد تک ایک سیاسی پروگرام پیش کرنے کی کوشش کی۔ٹریڈ یونینز کی حمایت کی۔KESC کی نجکاری ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور مزدوروں اور غریبوں کو سیاست میں مقام دینے کی بات کی مگر ساتھ ہی سیکولر اور بائیں بازو کی قوتوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔اس سے ان ملاؤں کے عوام اور محنت کش طبقے کی تحریک کے خوف کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ خود کو متبادل بنانے اور منوانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جلسے میں کوئی عوام نہیں تھے سب مختلف مدارس کے طالبِ علم اور تنخواہ دار ملاں تھے کیونکہ پاکستان کے لوگوں سے

زیادہ ان گھناؤنے ملاؤں کے کردار کا سنگین ترین تجربہ اور شاید کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ہم ان ملاؤں کو اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتے ہیں۔بقول عبدالحمید عدمؔ

ایک عصمت فروش بہتر ہے
آپ جیسے خدا فروشوں سے

دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ لوگ ماضی قریب میں دوصوبوں میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے بھیانک تجربے کو بھی ابھی تک فراموش نہیں کر سکے۔دوسرا اسامہ بن لادن کی کاکول اکیڈمی کے قریب رہائش گاہ کے منظرِ عام پر آنے سے بھی لوگوں میں بنیاد پرستوں کا چہرہ کھل کر سامنے آ گیا ہے اوران کی ریاستی آشیرباد کی وضاحت ہوگئی ہے۔اسی طرح ریاست سیاسی بحران سے نکلنے کے لیے دوبارہ فرقہ واریت کو فروغ دینے کی کوشش کررہی ہے۔عرب اور ایران کی کشیدگی سے شر اوراشتعال میں مزید اضافہ متوقع ہے۔حال ہی میں کراچی میں شیعہ سنی فساد میں درجنوں لوگوں کو قتل کیا جاچکا ہے۔بلکہ یہ کرائے کے قاتل ہاتھ میں لسٹیں لے کر گھومتے ہیں اور نام پتہ پوچھ کر قتل کررہے ہیں۔آنے والے دنوں میں اس آگ کو اور بھی بھڑکا یا جاسکتا ہے مگر اس سے عوام میں ان کی مقبولیت بڑھنے کی بجائے مزید کم ہوگی اور اگر آئندہ انجینئرڈ انتخابات میں ان کو اقتدار میں مناسب حصہ ملتا ہے تو وہ ان کو اور بھی زیادہ بے نقاب کرے گا۔

بورژوازی کی ایک جدید سیکولر ریاست بنانے میں ناکامی نے سارے معاشرے کو گھائل کر دیا ہے۔لوگ اذیت اور محرومی سے کراہ رہے ہیں۔ایسے میں رجعتی قوتوں کو وقتی طور پر مسلط رکھا جا سکتا ہے مگر عوامی شکتی کبھی نہیں مل سکتی۔قومی سوال پر ہمارا لینن والا موقف ہے۔ہم اثبات کی جگہ نفی میں اس کی حمایت کرتے ہیں یعنی ہم کسی بھی قسم کے قومی اور نسلی استحصال کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف حقِ خودارادیت اور علیحدگی کی مشروط حمایت کرتے ہیں اور عورت کے طلاق کے حق کی طرح حمایت کرنے کے باوجود قوموں کو علیحدہ ہونے پر نہ تو اکساتے ہیں اور نہ اسے تمام مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔مارکس نے آئرلینڈ کی قومی جدوجہد کا یہ حل پیش کیا تھا کہ ”آئرلینڈ سے ہمدردی کی قرارداد دوسری قراردادوں کا ایک قسم کا تعارف ہے جو تصدیق کرتی ہیں کہ (بین

الاقوامی انصاف کے علاوہ) موجودہ زبردستی بنائی ہوئی یونین کو توڑ دیا جائے اس کے بغیر انگریز محنت کش طبقے کی آزادی ناممکن ہے۔اس یونین کو ایک مساوی اور آزاد کنفیڈریشن میں بدل دیا جائے اگر ممکن ہو تو اور آئر لینڈ کو ایک آزاد ملک قرار دیا جائے اگر ضرورت ہو تو۔'' ہم بھی آج اس خطے کے تمام محروم قوموں کے محکوم طبقات کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤمل کر پہلے مٹھی بھر اقلیت کے ہاتھوں یرغمال بنائے ہوئے اکثریت کے استحصال پر مبنی اس نظام کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔جب مالیاتی سرمائے،کالے دھن اور بورژوا رشتوں کا جبر ختم ہو جائے گا تو قومی جبر،نسلی تسلط اور لسانی تعصب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

ریاست، پیپلز پارٹی اور عوام

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

مرزا غالبؔ

پیپلز پارٹی کی اپنی ایک طویل داستان ہے۔ جس کا تعلق محنت کش عوام کی اپنی زندگیوں میں سدھار اور بدلاؤ کے لیے کی جانے والی کوششوں کے کردار اور معیار سے ہے اور ساتھ ہی سامراجی قوتوں کے نظام کو چلانے کے حالات اور طریقہ کار سے ہے۔ انسانی و سماجی شعور عمومی طور پر قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ اس کی یہی قدامت پسندی اسے روایت پرست بنا دیتی ہے۔ چونکہ طبقاتی سماج میں عام طور پر اکثریت کا معیارِ زندگی مسلسل پست ہوتا رہتا ہے اور انہیں ہر لمحہ اپنی بقا کی جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ جو وہ پیدا کرتے ہیں اور جس کی انہیں ضرورت بھی ہوتی ہے اور وہ دستیاب بھی ہوتا ہے وہ اسے حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ ہمیشہ اپنی ضرویاتِ زندگی کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں۔ جس کو وہ حاصل نہیں کر پاتے وہ خواہشات بن کر ان کے لاشعور پر مسلط ہو جاتا ہے۔ وہ ان خواہشات کے خیالی محل تعمیر کرتے ہیں اور ان میں رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب ہر گزرتا پل ایک آزمائش ہو اور آنے والے لمحات باعث تشویش ہوں تو گزرا ہوا وقت قابلِ تحسین معلوم ہونے لگتا ہے۔ یوں زندگی کی مشکلوں سے فرار کا آسان راستہ یہ ہوتا ہے کہ ماضی میں پناہ حاصل کر لی جائے۔ سہل پسندی انسانوں کا وطیرہ ہوتی ہے۔ وہ جانے پہچانے راستوں اور آزمودہ طریقہ کار کو پسند کرتے ہیں تاوقتیکہ حالات اور واقعات ان کے شعور کو جھنجوڑ کر اسے فیصلہ کن انداز میں تبدیل نہ کر دیں۔ یوں حکایات اور روایات انسانوں کی بیساکھیاں بن جاتے ہیں۔ 'اچھے وقتوں کی بات ہے' اور 'ایک دفعہ کا ذکر ہے' جیسے جملے نفسیات کے لیے زیادہ قابلِ قبول اور پسندیدہ

ہوتے ہیں۔

پاکستان کی 65 سالہ تاریخ کے اوراق میں ایک ہی دفعہ کا ذکر ہے کہ جب یہاں کے مظلوم، محکوم اور لاچار لوگوں کی اکثریت نے علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ ملکیتی رشتوں کو چیلنج کر دیا تھا۔ زمینوں، فیکٹریوں اور جاگیروں پر قبضے کر لیے تھے۔ جابر ریاست کو شکست دے دی تھی اور جو کچھ ان کا تھا وہ حاصل کر لیا تھا۔ تاریخ کے اس سنہری باب کو ہم 69-68ء کے انقلاب کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ سب حاصلات بعد میں زائل ہوتی گئیں مگر ان سب کی یاد اور روداد پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل میں باقی رہ گئی اور اس عظیم کامیابی کی یہی روداد آج تک ایک روایت بن کر عوام کے اجتماعی شعور، احساس اور جذبات پر مسلط ہے۔

اس عظیم انقلاب نے اس ریاست کو بھی طبقاتی بنیادوں پر منقسم کر دیا تھا۔ 1970ء کے عام انتخابات میں فوجی بیرکوں سے بھی ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلسٹ پروگرام کو 60 فیصد سے زیادہ ووٹ پڑے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے صورتحال کو بھانپتے ہوئے سوشلزم کا نعرہ لگایا تھا۔ وہ مارکسسٹ، سوشلسٹ یا کوئی انقلابی لیڈر نہیں تھا اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی منصوبہ تھا اور سوشلسٹ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کے پاس کوئی ایسی ٹیم بھی نہیں تھی جس کے ذریعے یہ سب کچھ کیا جا سکتا۔ لیکن ریاست کی تقسیم واشگاف اعلان تھی کہ اس ریاست کو جڑ سے اکھاڑ کر بآسانی ایک مزدور ریاست کی تشکیل کی جا سکتی تھی۔ مگر اس ریاست سے مصالحت کر کے اس نے اس کو مضبوط کیا اور خاص طور پر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اخلاقی اور نفسیاتی طور پر پسپا فوج کو از سرِ نو طاقت اور توانائی دی۔ بھٹو سمجھ رہا تھا کہ وہ ریاست کو استعمال کر رہا تھا لیکن دراصل ریاست اسے استعمال کر رہی تھی۔ یہ حقیقت اب ایک تاریخی قانون کی حیثیت اختیار کر گئی ہے کہ بغیر تیاری اور ڈھانچوں کے ایک ریڈیکل پروگرام کے ذریعے عوامی مقبولیت حاصل کرنے والی قیادتیں ہمیشہ اسی عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اور ان کی تمناؤں کا قتل کر کے انہیں ناکارہ کرنے کے لیے سامراجی طاقتوں اور ریاست کے ہاتھوں میں آلہ کار کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اور انہیں آخر تک یہی زعم ہوتا ہے کہ وہ ریاست کو استعمال کر رہے ہیں اور جب ریاست کو ان کی ضرورت نہیں رہتی اور

تحریک کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں تو وہ انتہائی بے رحمی سے ان کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔

عوامی انقلاب کی طاقت کے نشے سے سرشار ذوالفقار علی بھٹو نے حکمران طبقات اور امریکی سامراج کے نظام پر جو کاری ضربیں لگائیں اس کے نتیجے میں وہ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسی ریاست کے ذریعے جس سے بھٹو نے مصالحت کی تھی اسے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ بھٹو کو کسی بھی قسم کی چھوٹ دینے یا مذاکرات کرنے کے لیے سامراجی تیار ہی نہیں تھے۔ وہ بھٹو کو ختم کر کے عوام سے ادھورے انقلاب کا انتقام لے رہے تھے اور انہوں نے موقع ملتے ہی اسے انجام تک پہنچا دیا۔

تب سے لے کر اب تک سامراج، ریاست، پیپلز پارٹی اور عوام میں ایک خاص قسم کا رشتہ رہا ہے۔ سامراجی مالیاتی سرمائے کا جبر جب حد سے بڑھ جاتا ہے اور سماج میں طبقاتی خلیج کے بہت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے عوام جب بھی بغاوت پر اترتے ہیں تو وہ اپنی ماضی کی روایات کے مطابق وہی طریقہ کار اپناتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ امریکی سامراج تحریک کے ایک حد سے تجاوز کر جانے کے خوف سے ریاست اور پیپلز پارٹی میں سمجھوتہ کروا کر اقتدار پیپلز پارٹی کو منتقل کروا دیتا ہے۔ پیپلز پارٹی ریاست کا حصہ بن کر نہ صرف محنت کشوں کے استحصال کو جاری رکھتی ہے بلکہ اسے تیز کر دیتی ہے۔ جس سے تحریک پسپا ہو کر گوشہ نشین ہو جاتی ہے۔ لوگ جدوجہد سے انکار کر دیتے ہیں اور اسی محرومی کو اپنا مقدر سمجھ کے اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ ایسے میں فوراً پیپلز پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کر کے اقتدار اپنے چہیتوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔

اس ریاست سے سب سے گھٹیا سمجھوتہ خود بے نظیر بھٹو نے کیا تھا۔ جب مرزا اسلم بیگ کو تمغہ جمہوریت سے نوازا گیا، نجکاری کی مزدور دشمن پالیسی دوبارہ شروع کر کے 69-68ء کے انقلاب کی آخری حاصلات کی واپسی کا عمل شروع کیا گیا اور جس کو ایک کارنامے کے طور پر جتایا گیا۔ طالبانائزیشن کے غلیظ اور مکروہ عمل کو روکنے کی بجائے اسے اپنا لیا گیا اور دائیں بازو کے غلیظ ترین اور مکروہ سیاستدانوں، محنت کشوں کے قاتلوں اور بھٹو کے دشمنوں کو پارٹی میں لبیک کہتے

ہوئے ان کو مراعات اور عہدوں سے نوازا گیا۔اسی دور میں یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور بعد میں بابر اعوان اور رحمان ملک جیسے لوگ بھی پارٹی میں شامل ہو گئے۔آج پارٹی کی اس حالت پر ماتم کرنے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کی بنیادیں اسی دور میں رکھی گئی تھیں اور ایسا نہیں تھا کہ یہ مزدوروں کے دشمن بھٹو کے بنیادی پروگرام پر ایمان لے آئے تھے بلکہ پیپلز پارٹی خود انتہائی دائیں جانب جاتے جاتے ان کی جھولی میں جا گری تھی۔شاید اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت سوویت یونین منہدم ہو چکا تھا، دیوارِ برلن گر چکی تھی اور چین میں بھی سرمایہ داری کی طرف لانگ مارچ کا آغاز ہو چکا تھا۔ایسی کیفیت میں بینظیر کے پاس مارکسی تناظر نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی عمومی فکری گراوٹ کی وجہ سے 'تاریخ کے خاتمے' کے مقبول ترین تھیسز پر ایمان لے آئی تھی اور اب اس کے خیال میں امریکی سامراج اور فوج کی حمایت کے بغیر نہ تو حکومت کی جا سکتی تھی اور نہ ہی کوئی عوامی سیاست کی گنجائش موجود رہی تھی۔قیادت کی اس غداری سے عوام بڑے پیمانے پر پسپا ہوئے اور انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے 1997ء کے انتخابات سے عملاً بائیکاٹ کیا اور جس کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کو من مرضی کے انتخابی نتائج کا موقع ملا اور ان انتخابات میں پیپلز پارٹی کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ان انتخابی نتائج سے خود بے نظیر اس حد تک دلبرداشتہ ہوئی کہ اس نے سیاست کو خیر باد کہنے کا فیصلہ سنا دیا۔مگر تاریخ اپنے فیصلے کسی اور انداز میں کیا کرتی ہے۔

مشرف آمریت کے دنوں میں محنت کش عوام حکمران طبقات کے کھلواڑ کو بہت قریب سے دیکھتے رہے۔ریاست کے امریکی سامراج کے ساتھ تضادات شروع ہوئے اور افغانستان میں کھیلی جانے والی گریٹ گیم کو پاکستانی ریاست نے ڈبل گیم میں بدل دیا۔درپردہ طالبان کی امداد جاری رہی۔یہ شرپسندوں کو پناہ دیتے رہے اور عام لوگوں کو مار مار کر اس کے عوض سامراجیوں سے ڈالر اور امداد وصول کرتے رہے۔جس کی وجہ سے ریاست میں پھوٹ اور انتشار اپنی انتہاؤں کو جا پہنچا۔یہ انتشار ایک خونریزی کی شکل اختیار کر گیا اور ڈرون حملے، خودکش حملے اور ان میں بے گناہ معصوم شہریوں کا قتلِ عام معمول کی بات بن گئے۔لیکن اس ساری بربادی کا خمیازہ محنت کش عوام

ہی بھگت رہے تھے اور حکمرانوں کی عیاشیاں اور لوٹ مار پوری شدومد سے جاری تھی۔اسی دورانیے میں معیشت کی شرح پیداوار 7 فیصد تک جا پہنچی۔ایک نئی مڈل کلاس بنائی گئی۔گاڑیوں، مکانات اور دولت کی ریل پیل تھی جسے محنت کش عوام محض دیکھ سکتے تھے۔سماج میں بڑھتی ہوئی طبقاتی خلیج محنت کش طبقے کے شعور کو جھنجوڑ رہی تھی۔امن وامان کی خراب صورتحال اور طبقاتی خلیج کی وسعت کی وجہ سے سماج پھر ایک طبقاتی بغاوت کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔تحریک کی حدت محسوس کی جانے لگی۔اس کا اظہار PTCL اور دیگر اداروں میں بھی ہونے لگا۔اس تحریک کا گلا گھونٹنے کے لیے ایک مصنوعی وکلا تحریک اس پر مسلط کر دی گئی۔مگر اس کے باوجود سامراجیوں نے بھانپ لیا کہ عوام کا وکلا تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ کسی طبقاتی تحریک میں اپنا اظہار کر سکتے تھے۔اسی کیفیت میں سامراج نے مشرف اور پیپلز پارٹی کی ایک ڈیل کروائی۔NRO کا معاہدہ کیا گیا جس میں تمام مقدمات ختم کر دیئے گئے اور جب اس ڈیل کے نتیجے میں بے نظیر واپس آئی تو لوگوں کو تحریک کا اظہار کرنے کا موقع مل گیا اور عوام کا سمندر اس کا استقبال کرنے کے لیے کراچی ایئرپورٹ پہنچ گیا۔یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سیاسی اجتماع تھا۔ڈیل کے پرخچے اڑ گئے۔سامراجی اور ریاستی درندے خوفزدہ ہو گئے۔خوفزدہ اور مشتعل ریاستی دھڑوں کے ہاتھوں بے نظیر بھٹو کا قتل ہو گیا۔تحریک مشتعل ہو گئی۔قتل کی شام ریاست ہوا میں معلق ہو گئی تھی اور اگر ایک انقلابی قیادت ہوتی تو اس تحریک کو ایک درست سمت میں گامزن کیا جا سکتا تھا۔

آج پیپلز پارٹی کے حلقوں میں سب سے زیادہ بحثوں کا محور یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا اگر بے نظیر زندہ ہوتی تو پارٹی کی حالت کچھ مختلف ہو سکتی تھی اور زیادہ تر کی رائے یہی ہوتی ہے کہ بے نظیر اگر ہوتی تو شاید ان کے لیے کچھ کر سکتی۔جب مستقبل میں کوئی امید کی کرن نہ ہو تو پھر یہ نتیجہ کافی منطقی معلوم ہوتا ہے۔لیکن بے نظیر کے پاس بھی فری مارکیٹ اکانومی اور سامراجی امداد کے علاوہ اس معیشت کو چلانے کا کوئی دوسرا طریقہ کار نہیں تھا اور درحقیقت سامراجیوں نے نہ صرف محنت کش طبقے کی تحریک کو شکست دینے کے لیے بلکہ پاکستانی ریاست جو ڈبل گیم کر رہی تھی اسے دوبارہ اپنی مکمل اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے بے نظیر کو ایک مصنوعی اعتماد اور ضمانت دے کر ریاست کے

امریکہ نواز دھڑے کے ذریعے ملک واپس بھیجا تھا۔ ریاست کا انتہائی دایاں بازو اس ڈیل پر محض اس لیے آمادہ ہو گیا تھا کہ ان کے پاس فوری طور پر کوئی دوسرا سیاسی متبادل نہیں تھا۔ اس کیفیت میں واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بے نظیر ہوتی تو بھی تو عوامی مسائل، بیروزگاری، غربت اور مہنگائی کی صورتحال شاید اس سے مختلف نہ ہوتی۔ کیونکہ مسئلہ بدعنوانی کا اور 'گڈ گورننس کے فقدان' کا نہیں ہے بلکہ بنیادی معاشی ڈھانچے اور انفراسٹرکچر کے گل سڑ جانے کا ہے۔

تاہم بے نظیر کے قتل کے بعد ریاست کا انتہائی دایاں بازو دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا اور بہت بڑا سیاسی خلا پیدا ہو چکا تھا۔ ایسی کیفیت کا فائدہ اٹھا کر امریکی سامراج بہت آسانی سے اپنے ایک اور 'مہرے' آصف علی زرداری کو پارٹی اور اقتدار منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کو وہ کافی عرصے سے اس مقصد کے لیے تیار بھی کر رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پیپلز پارٹی کو اس کیفیت میں اقتدار منتقل کیا گیا کہ یہ سامراج کی بغل بچہ ریاست بھی اپنے آقاؤں کے ساتھ شدید تناؤ کی کیفیت میں تھی۔ آصف علی زرداری نے پھر اس ڈری ہوئی اور کمزور ریاست کو طاقت دی کیونکہ اتنے شدید بحران اور سامراجی لوٹ مار کو قابلِ قبول بنانے کے لیے شاید اس کی اس سے پہلے سے کہیں زیادہ خود سامراج کو بھی ضرورت تھی۔ امریکہ اور ریاست کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے آصف علی زرداری کے بھی ریاست کے ساتھ متضاد قسم کے تعلقات نظر آتے رہے۔ ایک وقت میں پیپلز پارٹی میں پاک فوج زندہ باد کے نعروں کی بھیانک گونج سماعتوں میں زہر گھول رہی تھی تو تاریخ کا مضحکہ دیکھیں کہ اب یوسف رضا گیلانی جیسے ریاستی ٹاؤٹ بھی فوج کو ریاست کے اندر ریاست قرار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف آصف علی زرداری کے ذریعے سامراج نے اپنے مفاہمتی فلسفے کو اپنے منطقی عروج تک پہنچا دیا۔ اس پالیسی کے تحت آصف علی زرداری نے اپنی لوٹ مار میں تمام حکمران طبقات کی پارٹیوں کو ساجھے دار بنا لیا۔ اسی دوران دنیا بھر کو معاشی بحران نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ پاکستان بھی اس کے اثرات سے نہیں بچ سکا اور پیپلز پارٹی کو عوام پر تاریخ کے بدترین حملے کرنے پڑے۔ کبھی نہ دیکھی گئی مہنگائی، غربت اور ذلت میں لوگ سسک اور بلک رہے ہیں۔

معاشی بحران کی وجہ سے دایاں بازو دنیا بھر میں انتہائی کمزور ہو چکا ہے۔ان کے پاس کسی بھی قسم کی اصلاحات اور مراعات کا پیکج نہیں ہے بلکہ مزید معاشی حملے اور کٹوتیاں ہیں اور وہ یہ کام عوام کی اپنی یا بائیں بازو کی حکومتوں سے کروانا چاہتے ہیں تاکہ عوامی غم وغصے کا نزلہ ان پر نہ گرے۔اس لیے پاکستانی ریاست اور فوج مجبور ہیں کہ وہ آصف علی زرداری کی اس حکومت کو برداشت کریں اور سامراج کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی اور متبادل فی الحال نہیں ہے۔اس لیے اس بات کا بھی قوی امکان موجود ہے کہ آئندہ حکومتی سیٹ اپ میں بھی پیپلز پارٹی کو کمتر حصے کی بنیاد پر ہی سہی مگر اقتدار میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فوج نے آصف علی زرداری کو قبول کر لیا ہے بلکہ زرداری حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات امریکہ کے ساتھ ان کے تعلقات سے منسلک ہیں اور آج کل اگرچہ مذاکرات جاری ہیں مگر امریکہ اور پاک فوج کے تعلقات اب زیادہ پائیدار نظر نہیں آتے۔امریکہ کو فوج سے یہ گلہ ہے کہ انہوں نے اس کے رقیبوں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے ان کے ساتھ ڈبل گیم کی ہے جبکہ فوج کو امریکہ پر غصہ یہ ہے کہ انہوں نے بالخصوص 2 مئی کو ایبٹ آباد آپریشن کر کے نہ صرف اپنی عوام بلکہ پوری دنیا کے سامنے انہیں بالکل ننگا کر دیا ہے اور ان کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔وہ اپنی اس خجالت کو کم کرنے کے لیے مزید بلنڈر کیے جا رہے ہیں جن میں سے میموکیس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس لیے فوج عدلیہ کے ذریعے حتی الوسع کوشش کرے گی کہ اس حکومت کو اقتدار سے باہر نکال دیا جائے۔وہ پہلے ہی NRO اور میموکیس میں حکومت کو الجھائے ہوئے ہیں۔لیکن میموکیس میں فوج اور عدلیہ کو پھر ایک دفعہ خجالت اور شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے جس سے فوج کی فرسٹریشن مزید بڑھتی جا رہی ہے۔یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی بڑھتی ہوئی فرسٹریشن ان کو کوئی مہم جوئی کرنے پر مجبور کر دے مگر اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا بلکہ صورتحال اور بھی زیادہ بگڑ جائے گی۔اور اگر آئندہ کے حکومتی سیٹ اپ میں پیپلز پارٹی کو رکھا جاتا ہے تو ممکن ہے کہ قیادت میں کچھ چہروں کی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔

عالمی شہرت یافتہ جریدے 'نیوز ویک' کے افغانستان اور پاکستان کے لیے خصوصی نمائندے ران مور یو 20 جنوری کے نیوز ویک میں لکھتے ہیں کہ "آصف علی زرداری کے لیے اس سے بڑا

مسئلہ اور کیا ہوگا کہ اس کے جنرل اس سے نفرت کرتے ہیں۔لیفٹیننٹ جنرل طلعت مسعود کا کہنا ہے کہ 'فوج اسے ایک بے اصول آدمی سمجھتی ہے، جس کا کوئی نظریہ نہیں اور جو کسی بھی وقت امریکہ اور بھارت کی گماشتگی کے لیے تیار ہوتا ہے۔وہ اسے ایک طفیلیا سمجھتے ہیں اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں'۔جب سے امریکہ کے ساتھ فوج کے تعلقات زیادہ خراب ہوئے ہیں ان کی ناپسندیدگی میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ایک سیاستدان اور سیاسی کالم نگار ایاز امیر کا کہنا ہے کہ 'فوج امریکیوں سے خوش نہیں ہے اور وہ اس کا مدعا زرداری پر ڈال رہے ہیں۔نہ صرف فوج اور عدلیہ بلکہ ہر کوئی اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے'۔تاہم ابھی وقت اس کے ساتھ ہے۔اس کی اور پارلیمنٹ کی جسے وہ کنٹرول کرتا ہے مدت 2013ء میں ختم ہوگی۔زرداری اور اس کے حواری یقیناً آئندہ سینیٹ کے انتخابات میں بڑے مارجن سے کامیاب ہوں گے اور زرداری اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اس سال قبل از وقت عام انتخابات بھی کرا سکتا ہے۔حکومت کی تمام تر نااہلی کے باوجود اس کی پارٹی مضبوط اور زیادہ پائیدار ہے کیونکہ یہ واحد پارٹی ہے جس کی چاروں صوبوں میں عوامی بنیادیں موجود ہیں۔

زرداری کے دشمن مستقل مزاج ہیں لیکن حتیٰ کہ اگر اس کے خلاف تمام قوتیں متحد ہو کر اسے فارغ کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتی ہیں تو پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ پاکستان میں پھر بھی کوئی بہتری آنے والی نہیں ہے۔اگر وہ چلا گیا تو اس کا مطلب ہے کہ اور زیادہ عدم استحکام ہوگا۔پھر ایک اور رولا شروع ہو جائے گا۔''

گزشتہ چار برس خود پیپلز پارٹی کے لیے غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔بھٹو کے عدالتی قتل سے لے کر اب تک یہ پیپلز پارٹی کا سب سے بڑا اقتدار کا دورانیہ ہے۔ہمیشہ جب لوگوں کی توقعات پیپلز پارٹی سے پوری نہیں ہوتی تھیں تو شاید یہ ایک جواز رہ جاتا تھا کہ پارٹی کو اقتدار سے نکال دیا جاتا ہے۔مگر اس مرتبہ شاید پارٹی قیادت کے پاس یہ جواز بھی باقی نہ بچے۔شدید معاشی بحران اور سیاسی عدم استحکام کی کیفیت میں سامراج نے پیپلز پارٹی کو استعمال ہی نہیں کیا بلکہ نچوڑ لیا ہے۔وہ آئندہ کے لیے کچھ رکھ چھوڑنے اور لانگ ٹرم حکمتِ عملی بنانے کی صلاحیت سے مکمل عاری

دکھائی دیتے ہیں۔اس طویل ترین اقتدار میں پارٹی پر براجمان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے جہاں بہت کچھ لوٹا ہے وہیں اس لوٹ مار پر ان کے داخلی تضادات بھی شدت اختیار کر گئے ہیں۔بالخصوص مفاہمت کی پالیسی کی وجہ سے بہت سے فریقین کے اس لوٹ مار میں سانجھے دار بن جانے کی وجہ سے بہت سارے پارٹی کے لوگ اپنی خواہشات اور ہوس کے مطابق حصہ وصول نہیں کر پائے جس کی وجہ سے مختلف شخصیات کے پارٹی قیادت کے ساتھ اختلافات ابھرتے اور دم توڑتے رہے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ جب ریاست اور امریکی سامراج کے تضادات کے مابین پارٹی کا جھکاؤ سامراج کے پلڑے کی طرف زیادہ ہوا تو پارٹی کے اندر اپنے گماشتوں کے ذریعے ریاست نے ایک سیاسی خلفشار کو جنم دینے کی کوشش کی۔جب وہ اسے اقتدار سے ہٹا نہیں سکتے تھے تو انہوں نے اسے اندر سے توڑنے کی کوشش کی ۔اس سے پہلے بھی کئی دفعہ پارٹی کو توڑنے کی کوشش کی گئی اور بہت سارے جاگیردار اور سرمایہ دار ریاست کے اشاروں پر پارٹی سے علیحدہ بھی ہوئے مگر اس سے پارٹی کو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔شاہ محمود قریشی بھی اسی پالیسی کے تحت اپنے اصل مقام پر واپس لوٹ گیا۔اس کا پارٹی سے جانا' پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا' کے مصداق ہے۔

اسی طرح امریکی مفاہمتی ایجنڈے کو سبوتاژ کرنے کے لیے اور بالخصوص کراچی میں ایم کیو ایم کو قابو کرنے کے لیے ذوالفقار مرزا سے ایک لعن طعن اور ترش تنقید کی مہم شروع کرائی گئی۔ اگرچہ اس کے گرد پارٹی کارکنان اور خاص طور پر مڈل کلاس کے نوجوانوں کی کافی ہمدردیاں مجتمع ہونا شروع ہوگئی تھیں مگر اس سے مطلوبہ کام لے کر پھر وقتی طور پر اسے خاموش کرا دیا گیا۔آئندہ بھی ممکن ہے کہ اس کے کردار کی دوبارہ ضرورت پڑ جائے ۔مگر چونکہ اس کے پاس کوئی ریڈیکل پروگرام نہیں تھا اور اس نے محنت کشوں اور غریبوں کے ایشوز پر کوئی بات نہیں کی اس لیے محنت کش طبقات نے بھی اس کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا اور کیونکہ اس کا اپنا ماضی بھی پارٹی کی موجودہ قیادت کی کاسہ لیسی اور بھتہ خوری سے لتھڑا ہوا تھا اس لیے بھی اس میں مڈل کلاس کے لیے تو شاید کوئی دلچسپی تھی مگر محنت کشوں کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ناہید خان، شیری رحمان، امین فہیم جیسے لوگ اپنے

حصے کی بنیاد پر روٹھتے اور منتے رہیں گے۔مگر ایک بات تو طے ہے کہ آصف علی زرداری پارٹی معاملات پر ابھی تک مکمل کنٹرول حاصل نہیں کر پایا۔اس کی بہن کا بھی چونکہ ماضی میں پارٹی میں کوئی زیادہ سیاسی کردار نہیں تھا لیکن اس لوٹ مار میں اور پارٹی معاملات میں اس کو زیادہ حصہ دے دینے کی بنیاد پر بھی بہت ساری جگہ پر آصف علی زرداری کے لیے مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے کئی مرتبہ قبل از وقت بلاول،آصفہ اور بختاور کو بھی ایکسپوز کرنا پڑا ہے۔

روایات بہت بڑی سیاسی حقیقت ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود ابدی اور غیر متغیر نہیں ہوتیں۔اس اقتدار میں تلخ ترین تجربات کی بنیاد پر پارٹی قیادت کی طرف محنت کشوں کا رجحان تبدیلی کے ایک عبوری مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔یہ درست ہے کہ پیپلز پارٹی کی انتہائی دائیں جانب جھکاؤ کے باوجود محنت کشوں کو اس کے بائیں جانب سوائے خلا کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ اگرچہ پارٹی بظاہر خالی نظر آتی ہے مگر آج بھی محنت کشوں کی خاموش حمایت پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے۔مگر اس تعلق اور رجحان میں غیر محسوس انداز میں بڑی تبدیلی آرہی ہے۔پہلے محنت کش اپنے تمام مسائل کے حل کے طور پر پارٹی کو دیکھتے تھے یا یوں سمجھتے تھے کہ انہیں اپنی بقا اور آنے والی نسلوں کے تحفظ کے لیے پارٹی کی ضرورت ہے مگر اب وہ پارٹی کے ساتھ اس لیے ہیں یا اس لیے قیادت کے خلاف کسی تحریک یا مزاحمت کا باعث نہیں بن رہے کہ اب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پارٹی کو ان کی ضرورت ہے۔محنت کش مڈل کلاس کے لیڈروں کی طرح روز روز پارٹیاں اور وفاداریاں تبدیل نہیں کرتے۔اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ شاید اس مرتبہ 27 دسمبر کو بے نظیر کی برسی پر اتنے زیادہ لوگ گڑھی خدا بخش نہ جاتے مگر میڈیا اور عدلیہ کے ذریعے ریاست کے دائیں بازو نے پارٹی قیادت کا جو گھیراؤ کیا اس کی وجہ سے لوگ اپنی روایت کو سہارا دینے کے لیے وہاں پہنچے۔ گویا وہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی شرکت موجودہ قیادت سے محبت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ریاست اور دائیں بازو سے شدید ترین نفرت کی بنیاد پر تھی۔بلکہ وہاں جا کر بھی لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی اور پارٹی قیادت کی پالیسیوں کے خلاف شدید نعرے بازی کی۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پارٹی کے مزید گھیراؤ یا دباؤ کی وجہ سے گرتی ہوئی حمایت میں تھوڑا بہت ٹھہراؤ آجائے مگر

عمومی طور پر روایت اپنے گلنے سڑنے کے عمل میں داخل ہو چکی ہے جو سیدھی لکیر میں چلنے والا عمل نہیں ہے۔ یہ عمل آگے بھی بڑھ سکتا ہے اور ناگزیر وجوہات کی بنیاد پر یہ سارا عمل تعطل کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے مستقبل کا حتمی فیصلہ نہ صرف ملک میں بلکہ دنیا بھر میں ہونے والے واقعات کریں گے۔

آصف علی زرداری کے پاس گرتی ہوئی حمایت کو بحال کرنے کے لیے کوئی سیاسی اور معاشی پروگرام نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے کو ری اوپن کر کے عوام کی توجہ اس میں مبذول کرانے کی کوشش کی۔ لیکن درحقیقت عوام کا اس مقدمے سے نہ تو کوئی تعلق ہے اور نہ اس ریاست کے اداروں پر ان کا کوئی اعتماد ہے۔ عوام نے تو بھٹو کیس کا فیصلہ اسی دن خود سنا دیا تھا جب وہ 1986ء میں 10 لاکھ کی تعداد میں بے نظیر کے استقبال کے لیے لاہور کی سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ اس لیے NRO، میمو اور بھٹو کیس یہ تمام نان ایشوز ہیں جن میں عوام کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

کسی بھی متبادل کی غیر موجودگی میں لوگ جب بھی دوبارہ ایک تحریک میں ابھریں گے۔ تو پھر وہ ناگزیر طور پر اپنی روایت کی چوکھٹ پر جائیں گے۔ مگر اس دفعہ شاید حاضری دینے نہ جائیں بلکہ جواب طلبی کے لیے جائیں اور اگر ان کو مطلوبہ جواب نہ ملا تو پھر وہ بالآخر اس کوہ ہمالیہ سے زیادہ بڑے بوجھ کو جھٹک کر نئی قیادت تراش لائیں اور نئی انقلابی روایت کو جنم دیں گے اور اگر انہیں لینن اسٹ قیادت میسر آ گئی تو وہ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کریں گے جو ان کے آباء و اجداد نے 69-68ء میں دیکھا تھا اور اس کے لیے تاریخ ساز جدوجہد کی تھی۔

سیاسی ہیجان، نوجوان نسل اور طبقاتی شعور

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

علامہ اقبال

پاکستان میں 2012ء کا آغاز ہی دنیا بھر کی طرح شدید سیاسی گرما گرمی سے ہوا ہے کیونکہ پھر سے اقتدار کا کھیل شروع ہونے کے اشارے مل رہے ہیں۔ جلسے، جلوس، ریلیاں روز کا معمول بن گئے ہیں۔ بجلی، گیس، پانی، روٹی، کپڑا، مکان، روزگار، تعلیم، ٹرانسپورٹ، علاج اور امن وامان پاکستان میں اس وقت کونسا ایسا مسئلہ ہے جو سلگ نہیں رہا۔ لیکن ان جلسوں میں زیرِ بحث آنے والے مسائل کی فہرست ہی بالکل مختلف ہے۔ بدعنوانی، عدلیہ کا احترام، اداروں کا تقدس، قومی وقار وغیرہ کا سماج کی اکثریتی پرتوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اصل مسائل پر اس لیے کوئی بات نہیں کر رہا کہ کسی کے پاس ان کا کوئی حل موجود نہیں۔ حرکت تیز ترین ہے اور سفر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان سب کی تقریروں میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ ہے امریکہ کی جارحانہ مخالفت۔ اس کے ساتھ ساتھ سب ایک دوسرے کو اسٹیبلشمنٹ کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں حالانکہ یہ سب لوگ اسٹیبلشمنٹ کی ہی نہ صرف پیداوار ہیں بلکہ ابھی بھی کسی نہ کسی دھڑے سے منسلک ہیں۔ آج کل یہ سب لیڈر اور ان کے پیچھے متحرک ریاست کے مختلف دھڑے اس لیے اپنی سیاسی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے کے لیے بے چین ہیں تاکہ اقتدار کی بندر بانٹ میں حصہ بقدرِ جُثہ وصول کیا جاسکے۔

ان میں سے بہت سارے لوگ اسٹیبلشمنٹ سے شدید ناراض بھی ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اسٹیبلشمنٹ نے ان کو ناکارہ سمجھ کر اس دفعہ اقتدار کی گھڑ دوڑ کے لیے نئے گھوڑے تیار کرنے شروع کر دیئے ہیں حالانکہ وہ ابھی بھی ان کی کافی خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک درست

بھی ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کے سنجیدہ پالیسی سازوں کا یہ خیال ہے کہ قوم پرستوں سے لے کر انتہا پسندوں تک سب چلے ہوئے کارتوس ہیں اس لیے اگر اسٹیبلشمنٹ کو اپنی بالادستی کو برقرار رکھنا ہے تو اس دفعہ نیا سیاسی تڑکا لگانا ضروری ہو گیا ہے۔مگر مسئلہ یہ ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سارے سنجیدہ لوگوں پر مشتمل نہیں ہے۔کچھ انتہائی ہٹ دھرم، جنونی اور قدامت پسند لوگ بھی اسٹیبلشمنٹ کی ٹیم کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ بہت وسیع معاشی بنیادیں رکھنے کی وجہ سے وہ ایک لمبے عرصے سے سیاسی اکھاڑے کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں اور جب ان کو ایسے لگتا ہے کہ ان کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ فوراً اپنا نیا ناٹک شروع کر دیتے ہیں۔ایسی ریاست جو کھوکھلی ہو چکی ہو، جس کی معیشت عملاً دیوالیہ ہو چکی ہو اور جو سیاسی نمائندگی کے شدید بحران میں مبتلا ہو اس میں سیاسی نفسانفسی کا یہی عالم ہو سکتا ہے۔یہ سب لوگ اس لیے پریشان ہیں کہ ان کا یومِ حساب قریب آنے والا ہے اور ان کے نامہ اعمال بالکل سیاہ ہیں۔بہت جلد حشر کا میدان لگنے والا ہے اور حساب لینے والا کوئی اور نہیں بلکہ جیتے جاگتے عوام ہوں گے۔

ریاست کے انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا اس سیاسی ماحول سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔بورژوا سیاست کا مرکزی سوال اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود یہی ہوتا ہے کہ معیشت کو کس طریقے سے چلایا جائے کہ حکمران طبقات کی شرح منافع میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے اور عوام بھی اس میں سے زیادہ حصہ مانگنے پر استفسار نہ کریں اور کریں بھی تو ان کو کم سے کم پر بخوشی یا بالجبر راضی کر لیا جائے۔مگر اس وقت اسٹیبلشمنٹ کی حالت اس جواری کی طرح ہو چکی ہے جو اپنے تمام پتے قبل از وقت شو کر چکا ہو اور ہارے ہوئے جواری کو بھکاری بننے میں زیادہ دیر نہیں لگا کرتی۔یہی وجہ ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کو برا بھلا کہنا ایک فیشن بنتا جا رہا ہے اور اسٹیبلشمنٹ بھی کچھ زیادہ ناراض ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔اسی طرح امریکہ بھی اس خطے پر اپنا اثر ورسوخ کسی بھی قیمت پر برقرار رکھنے کے لیے اس سارے کھلواڑ میں ملوث ہے اس لیے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے کون کتنی گالیاں نکال رہا ہے بلکہ اس کے لیے اہم بات یہ ہے کہ اس کیفیت میں ان کے نظام اور مفاد کے لیے کون بہتر کام کر سکتا ہے۔اس سارے سیاسی

کھلواڑ کے منطقی انت پر مہرِ تصدیق تو پھر امریکہ کو ہی ثبت کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کو گالیاں نکالنے کے باوجود سب لوگ اس کے دستِ شفقت کے طلبگار بھی ہیں کیونکہ معاشی طور پر عالمی مالیاتی اداروں کا ابھی تک کوئی نعم البدل نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا۔ مختصر یہ کہ آئندہ کے تناظر کے حوالے سے یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی سیاسی معیشت کی موجودہ کیفیت میں صرف امریکہ کی ایما، سرپرستی، نگرانی اور پشت پناہی سے چلنے والی 'امریکہ مخالف' حکومت ہی قابلِ قبول اور کسی حد تک جز وقتی پائیدار ہو سکتی ہے۔

سرمایہ داری کے موجودہ بحران نے صرف محنت کش طبقے کو برباد نہیں کیا ہے بلکہ درمیانے طبقے کی وسیع پرتوں کے معیارِ زندگی کو بھی تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت اپنے طبقے کو چھوڑ کے اعلیٰ طبقے کی صفوں میں جانے کی کوشش کرنے والے درمیانے طبقے کو غربت کی لکیر کی طرف ایک مقناطیسی قوت کھینچ رہی ہے۔ اس مڈل کلاس کا اضطراب، بے چینی اور نفسیاتی ہیجان اپنے عروج کو پہنچ رہا ہے۔ یہی ہیجان اور تذبذب بنیاد پرستوں اور رجعتی قوتوں کو دوبارا تھوڑا بہت سماجی مواد فراہم کر رہا ہے جس کی بنا پر طاقت کی یہ رسہ کشی جاری و ساری ہے۔ محنت کش طبقہ اور غریب عوام ابھی تک براہِ راست اس کھیل میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ اگرچہ انہیں اس میں گھسیٹنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے مگر یہ محنت کش طبقے کی اخلاقی اور ثقافتی برتری کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اس قدامت پسندی، رجعتیت اور جنونیت کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ حال ہی میں ہونے والے ملاؤں کے جلسوں میں مڈل کلاس کی بھی وسیع پرتوں کی حمایت نظر نہیں آئی ہے بلکہ زیادہ تر ریاستی خیرات سے چلنے والے مدارس اور مساجد کے خطیب اور طالبِ علموں کی تقریباً تمام افرادی قوت کو استعمال کر کے طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس سیاسی اکھاڑے میں یوں تو آج کل کافی رش ہے مگر بڑا مقابلہ دو بڑے پہلوانوں کے مابین متوقع ہے۔ ان میں ایک تو اس کھیل کے پرانے جانے پہچانے جگادری نواز شریف ہیں اور دوسرے سیاست کے نام نہاد ابھرتے ہوئے ستارے عمران خان ہیں۔ گزشتہ 6 ماہ سے عمران خان نہ صرف ملکی بلکہ عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ حکمران طبقے اور مڈل کلاس دونوں

کی بہت سی توقعات عمران خان سے وابستہ ہیں۔انتہائی مجرد اور خیالی سیاست سے تنگ آ کر بالآخر عمران خان کو یہ اندازہ ہو ہی گیا کہ کرکٹ بورڈ کی انتظامیہ اور ریاستی مشینری میں کوئی قدر بھی مشترک نہیں ہوتی۔کرکٹ بورڈ کو بلیک میل کر کے اپنی مرضی کی ٹیم سلیکٹ کروائی جا سکتی ہے مگر جب ایک دفعہ ریاستی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنڈے کو اپنا لیا جائے تو کام بھی ان کا کرنا پڑتا ہے اور ٹیم بھی ان کی رکھنی پڑتی ہے ورنہ وہ کپتان کو بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔حقیقت میں اسٹیبلشمنٹ کے مختلف دھڑے مکمل طور پر عمران خان پر متفق نہیں ہو پا رہے تھے اور وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ 'ون مین شو' سے خوفزدہ بھی تھے اس لیے مشرف اور ضیا آمریت کی باقیات اور اس کھیل کے پرانے کئی کھلاڑی مستقبل میں اپنے ایجنڈے کی ضمانت کے طور پر عمران خان کے دائیں اور بائیں جمع کر دیئے گئے ہیں۔اب اتنے ہجوم میں خود عمران خان کو تلاش کرنا اور اس کی نشاندہی کرنا کافی مشکل دکھائی دیتا ہے۔ملک بھر میں جلسوں اور دوروں کی ایک کافی حد تک کامیاب فلم کے باوجود نہ تو اتنی بڑی عوامی حمایت حاصل کی جا سکی ہے کہ جس کی بنیاد پر حکومت کو کسی تحریک کے ذریعے گرایا جا سکے اور نہ ہی اسٹیبلشمنٹ میں مکمل اتفاقِ رائے پیدا کیا جا سکا ہے بلکہ بہت سے پرانے کھلاڑی اور بھی زیادہ مشتعل ہو گئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس سارے عمل پر کالے دھن کی کثیر رقم خرچ کی گئی ہے اور ریاست کے پاس اس کی گنجائش بھی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔اب ان کے لیے مصیبت یہ بن گئی ہے کہ جب تک عمران خان کے جلسے ہوتے رہتے ہیں عمران خان بحثوں اور گفتگو کا محور رہتا ہے مگر اس کے فوری بعد لوگ اسے بھول جاتے ہیں اور دوبارہ بجلی، پانی اور گیس کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔عمران خان کی حالت اس کمرشل فلم کی طرح ہو گئی ہے جو جب تک پردہ سکرین پر رہتی ہے اس کا چرچا رہتا ہے اور جونہی پردے سے اترتی ہے لوگ اس کا نام بھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوتے ہیں اور اس فلم کو پردے پر مسلسل رکھنے کی مالیاتی صلاحیت اس ریاست میں نہیں ہے۔صرف کراچی کے عمران خان کے جلسے پر میڈیا رپورٹس کے مطابق **40** کروڑ کے اخراجات کیے گئے تھے۔

جو چند سنجیدہ سیاسی کارکن ایک طویل عرصے سے ان تھک محنت کے ذریعے تحریکِ انصاف کو

بنانے کی کوشش کررہے تھے یا وہ چند سنجیدہ نوجوان جو عمران خان کو مسیحا سمجھ رہے تھے وہ تو ان پرانے بھیڑیوں کے پارٹی میں گھس جانے کی وجہ سے مایوس ہو کر اب کنارہ کش ہو رہے ہیں۔جو لوگ گزشتہ عشرے سے اس امید پر عمران خان کے ساتھ تھے کہ جب اس کی باری آئے گی تو ان کو بھی اقتدار میں آ کر لوٹ مار کرنے کا موقع مل جائے گا ان کی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا ہے اور وہ بھی مایوس ہوئے ہیں کیونکہ اب ان کو لگنے لگا ہے کہ یہ نئے آنے والے پرانے پاپی پارٹی پر قابض ہو جائیں گے اوران کو کچھ نہیں ملے گا۔مگر عمران خان وزیرِ اعظم بننے کے لیے بہت بیتاب ہے بلکہ کچھ عرصہ تو وہ ذہنی طور پر خود کو وزیرِ اعظم سمجھتا رہا ہے۔اب اس کے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں اور خود اسٹیبلشمنٹ نے بھی اسے انتظار کرنے کا اشارہ دے کر ویٹنگ لسٹ میں کھڑا کر دیا ہے۔اگر پیپلز پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کر دینے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو عمران خان کا بڑا مقابلہ نواز شریف سے متوقع ہے اور جوں جوں اس عمل میں تاخیر ہو گی اس سے پھر نواز شریف سامراجیوں اور اسٹیبلشمنٹ کے مزید قریب ہونے کی کوشش کرے گا جس سے عمران خان بہت خوفزدہ ہے۔

ایک لمبے عرصے تک ن لیگ کی اسٹیبلشمنٹ اور امریکہ کے خلاف نعرے بازی دونوں فریقین کو اپنی ضرورت اوراہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔کافی تگ ودو کے بعد اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ن لیگ کا ڈیڈ لاک اختتام پذیر ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے جس کا اظہار میمو کیس اور دیگر پیپلز پارٹی حکومت کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے تضادات میں ن لیگ کی فوج اور ایجنسیوں کی والہانہ حمایت میں ہوا ہے۔لیکن اس سے قبل حکومت کے اتحادی اور پھر بعد میں ایک لمبے عرصے تک دوستانہ اپوزیشن کا کردار نبھاتے نبھاتے ن لیگ کافی حد تک پنجاب میں بھی اپنی بچی کھچی ساکھ کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہے۔خاص طور پر تاجر، دوکاندار اور مڈل کلاس جو نواز شریف کی حمایت کی اصل پاکٹس ہیں ان کے کاروبار بڑے پیمانے پر برباد ہونے کی وجہ سے وہ وفاداریاں بدلنے میں کافی سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔حال ہی میں معاشی پالیسیوں کے خلاف صنعتکاروں نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صنعتکاروں کو خود سیاست کرنی ہے تو پھر انہیں ن لیگ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ماضی میں ان کی

ٹیکس چوری، بجلی چوری اور بدعنوانی کا تحفظ، سستے قرضوں کی فراہمی اور پھر ان کی معافی اور ضرورت پڑنے پر ان کے حقوق کی سیاسی نمائندگی یہی وہ بنیادی مفادات ہیں جن کی بنیاد پر لمبے عرصے تک تاجر برادری اور صنعتکاروں کی حمایت ن لیگ کی جھولی میں پڑی رہی ہے۔ مگر اب ان سب لوگوں کی امیدیں ن لیگ سے ٹوٹ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بالائی پنجاب میں خاص طور پر ن لیگ کی پوزیشن کافی کمزور ہے۔ انہی حالات کے پیشِ نظر اب نواز شریف سندھ، بلوچستان اور پشتونخواہ میں کافی ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اپنے نظریاتی انحراف کی وجہ سے تمام قوم پرست ماضی میں بھی اس پنجابی شاونسٹ کی گود میں بیٹھ کر اقتدار کے مزے لیتے رہے ہیں۔ اس دفعہ بھی ان کے ساتھ گفت وشنید جاری ہے اور فائنل راؤنڈ میں شرائط اور معاملات طے کرانے کے لیے پھر اسٹیبلشمنٹ کے جگادری بہت جلد منظرِ عام پر نظر آئیں گے۔ ساتھ ہی اب ن لیگ دوبارہ پیٹرول کی قیمتوں میں اضافے، گیس اور بجلی کے بحران جیسے مسائل، جن کی وجہ سے صنعتیں اور کاروبار مکمل برباد ہو چکے ہیں پر حکومت مخالف تحریک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ الیکشن سے قبل سیاسی ہلا گلا کر کے دوبارہ تاجر برادری اور مڈل کلاس کی کچھ پرتوں کا اعتماد جیتا جا سکا۔

حال ہی میں 'سونامی' سیزن نے مڈل کلاس کی نفسیات میں کافی بھونچال برپا کیے ہیں جس کے اثرات ن لیگ پر بہت بھیانک انداز میں پڑے ہیں۔ پہلے بھی ایسی خبریں گردش کرتی رہی ہیں کہ ن لیگ میں قیادت کی سطح پر اختلافات اب تضادات کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے ہیں۔ کافی عرصے تک تو جاوید ہاشمی ان تضادات کے مرکزی کردار کے طور پر زیرِ بحث آتا رہا۔ پھر کچھ حلقوں میں نواز اور شہباز کے مابین کشیدگی کے انکشافات بھی کیے جاتے رہے۔ مگر ابھی زیادہ سیاسی دباؤ کی وجہ سے دیگر بہت سارے فروعی اور گروہی قسم کے اختلافات سر اٹھانا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ عمل آنے والے دنوں میں مزید بڑھ سکتا ہے۔ جاوید ہاشمی تو پہلے ہی 'توبہ تائب' ہو کر اپنی دنیا اور 'آخرت' سنوارنے کے لیے پیرِ کامل کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں اور بہت سارے لوگ بھی اپنے داغ دھونے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں اور اسی بنا پر تحریک انصاف کی طرف سے پیشکشوں پر وہ ن لیگ میں اپنا اثر ورسوخ اور اقتدار میں زیادہ حصے کا مطالبہ کریں گے۔ پہلے ہی

پنجاب میں 'ون مین شو' ان دنوں زبان زدِ عام ہو چکا ہے۔ 15 سے زیادہ وزارتیں خود شہباز شریف کے پاس ہیں۔ پنجاب حکومت درحقیقت فیصل آباد کے گھنٹہ گھر سے مشابہت رکھتی ہے جہاں ہر راستہ شہباز شریف کے چرنوں میں ہی جا کر ختم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گڈ گورننس اور بہترین منتظم کہلانے والے شہباز شریف کے دورِ حکومت میں اس دفعہ ناقص کارکردگی کی انتہا ہو چکی ہے اور بدعنوانی سمیت تمام مسائل اس وقت پنجاب میں باقی تمام صوبوں سے زیادہ ہیں۔

ق لیگ اور دیگر تمام قسم کی مسلم لیگیں مل کر پھر کوئی اتحاد بنانے کی کوشش کریں گی جس کی بنا پر آئندہ اقتدار میں مناسب حصے پر کچھ لے دے کیا جا سکے۔ وہ پہلے بھی کبھی کوئی عوامی سیاست نہیں کرتے تھے اور اب بھی وہ اپنی ہڈی کے لیے ایجنسیوں کے ساتھ معاملات کرنے کی کوشش میں ہیں۔ چوہدری خاندان ویسے بھی پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ کا سب سے وفادار خاندان رہا ہے اور اس کڑے وقت میں ایجنسیاں ضرور ان کے تجربے اور صلاحیتوں سے مستفید ہوں گی۔ خاص طور پر پیر پگاڑا کی وفات کے بعد بڑے پیمانے کی جوڑ توڑ میں ان کا کردار پہلے کی نسبت بڑھ جائے گا۔ مشرف کی حالت بالکل کسی چربہ فلم کے اس ہیرو کے جیسی ہے جس کی سلطنت اور محبوبہ بہت سارے غنڈوں کے قبضے میں ہے اور وہ وقتاً فوقتاً بڑھک بازی کر کے ان غنڈوں کو ڈرانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ فلموں میں تو آخر میں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں ایسے ہیرو کی قسمت میں نامرادی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس لیے یہ فلم بھی وقفوں وقفوں سے یونہی چلتی رہے گی اور مشرف کا کوئی بہت بڑا سیاسی کردار بنتا ہوا نظر نہیں آتا۔

ایم کیو ایم ملک کے سب سے بڑے پرولتاریہ کے شہر پر اپنے فاشسٹ تسلط کی بنیاد پر پھر اقتدار میں بڑے حصے کی خواہشمند ہو گی۔ مخالف دھڑے کو اگرچہ امریکہ کے ساتھ ان کے حد سے بڑھے ہوئے یارانے پر شدید تحفظات ہیں اور گزشتہ برسوں میں وہ ایم کیو ایم کی اجارہ داری کو مختلف حربوں اور طریقوں سے چیلنج بھی کرتے رہے ہیں اور ان کو یہ باور کراتے رہے ہیں کہ تمہیں ہمارے ایجنڈے پر ہی کام کرنا ہو گا۔ امن کمیٹی، اے این پی، پی پی آئی اور حقیقی کی طرف سے مسلح مزاحمت کے ذریعے بھی اپنے وجود کو تسلیم کرانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ مگر چونکہ ریاستی دھڑے

آپس میں لڑلڑ کرانتہائی کھوکھلے اور بوسیدہ ہو چکے ہیں اس لیے وہ ایم کیوایم سے مکمل طور پر کراچی واپس لے ہی نہیں سکتے۔لیکن اگر ایم کیوایم قاتل اور فاشسٹ پارٹی ہے تو جو اس طاقت کے کھیل میں ان کے رقیب ہیں وہ کونسا کوئی دودھ سے دھلے ہوئے ہیں۔ان کے ہاتھ بھی ان گنت معصوموں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔میڈیا، سیاستدان، دانشور، عدالتیں، ایجنسیاں اور عوام میں سے کون ایسا ہے کہ جس کو پتہ نہیں ہے کہ ایم کیوایم کی سماجی بنیادیں بہت کمزور ہیں اور انہوں نے کلاشنکوف کے ذریعے سارے شہر کو بلکہ حیدرآباد کے بھی اہم علاقوں کی عوام کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔مگر یہ اس پورے نظام کی خستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔جمہوریت کے چیمپئین بھی زیادہ سے زیادہ مذاکرات کے ذریعے ان کو راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مہان عدالتیں اور ایجنسیاں بھی کراچی میں ان کا گھیراؤ مکمل کر لینے کے بعد پھر گھٹیا قسم کا سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔93اور 96ء میں دو بڑے آپریشنز کے باوجود کراچی پر آج بھی ایم کیو ایم کا ہی قبضہ ہے۔ریاستی دھڑوں کے یہ تضادات آنے والے دنوں میں بھی چلتے رہیں گے اور وقتاً فوقتاً کراچی کو خون میں نہلایا جاتا رہے گا اور کراچی میں ایم کیوایم کی طاقت کو انتخابات میں بھی کچھ کم کرنے کی کوشش کی جائے گی مگر دونوں کی اپنی اپنی نااہلیوں اور کمزوریوں کی بنا پر بالآخر معاملات طے پا ہی جائیں گے۔لیکن بہت زیادہ دینے پر ایم کیوایم کبھی راضی نہیں ہو گی اور اس کے لیے جتنے بڑے فوجی آپریشن کی ضرورت پڑے گی اس کی اب اس ریاست میں گنجائش بھی نہیں رہی۔ایم کیو ایم کے اندر بھی طویل ترین اقتدار کے دنوں میں اختلافات کم ہونے کی بجائے مزید بڑھے ہیں۔خاص طور پر عامر خان کی واپسی کے بعد ایم کیوایم کے اندر طاقت کے لیے رسہ کشی اور شدید ہو جائے گی جس کی وجہ سے کراچی میں انتشار اور عدم استحکام میں اضافہ ہو گا۔اس کے ساتھ ساتھ بیروزگاری کے بڑھنے اور آبادی کے دباؤ میں اضافے کی وجہ سے کراچی میں سٹریٹ کرائمز اور دیگر وارداتوں میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہو رہا ہے اور ان تمام گروپوں کو ریاست کی در پردہ حمایت بھی حاصل ہے۔اسی طرح کرائے پر قتل اور خون خرابہ کرنے والے غیر سیاسی جرائم پیشہ گروہوں کے اثرورسوخ میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے اور ان کو بھی ریاست کے مختلف دھڑوں کی پشت پناہی

حاصل ہے۔رینجرز کے بھی اپنے کاروباری اور مالیاتی مفادات پروان چڑھے ہیں جن کی وجہ سے کراچی میں امن وامان بحال ہو جانا خود ان کے بھی مفاد میں نہیں ہے۔ یوں ہزاروں معصوموں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کو عوام کی طاقت سے ہی شکست دی جاسکتی ہے۔اس لیے کراچی کے عوام کو ایک سوشلسٹ انقلاب ہی اس وحشت اور بربریت سے نجات دلا سکتا ہے۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر ملک بھر میں مسلسل سیاسی عدم استحکام بڑھتا ہی چلا جائے گا۔عوام کی پیپلز پارٹی حکومت سے مایوسی اور بدگمانی کی وجہ سے آئندہ انتخابات میں بڑے ٹرن آؤٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی ایک حالیہ اخباری رپورٹ کے مطابق مختلف سروے کے نتائج یہ ثابت کرتے ہیں کہ عوام کا اس سارے نام نہاد جمہوری عمل سے اعتماد مکمل طور پر اٹھ چکا ہے۔ 50 فیصد سے زیادہ رجسٹرڈ ووٹرز کا ابھی سے یہ کہنا ہے کہ وہ ووٹ کاسٹ ہی نہیں کریں گے۔نوجوانوں میں یہ تناسب اور بھی زیادہ ہے۔اس طرح ریاست کو اپنے من مرضی کے نتائج مسلط کرنے کا موقع مل جائے گا۔مگر اس مرتبہ اسٹیبلشمنٹ بھی کافی دباؤ میں ہوگی ۔انتخابات سے قبل ہی ایجنسیوں کی مداخلت اور دھاندلی کے الزامات گردش کر رہے ہیں۔انتخابات کے نتائج کچھ بھی ہوں ہارنے والے لازماً دھاندلی کے الزامات عائد کریں گے۔اس لیے ایجنسیاں پہلے سے ہی تمام پارٹیوں کو اقتدار میں حصہ دینے کی کوشش کریں گی۔ویسے بھی کیونکہ کسی بھی پارٹی کا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ کوئی اصولی اور نظریاتی اختلاف نہیں ہے اس لیے ہر کوئی کسی کے بھی ساتھ اتحاد اور الحاق کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔یہاں تک کہ سیاسی ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے نام پر اور جمہوری عمل کو مضبوط کرنے کے لیے عمران خان اور نواز شریف کو بھی قریب لانے میں کوئی بڑی ہچکچاہٹ یا مزاحمت کا اندیشہ نہیں ہوگا۔پاکستان میں جمہوریت، آمریت اور ٹیکنوکریسی سمیت تمام طریقہ کار آزمائے جا چکے ہیں۔اس دفعہ اتنی کمزور اور نحیف پارلیمانی جمہوریت دیکھنے میں آئے گی جس کے لیے 'ہنگ پارلیمنٹ' کا لفظ بھی ایک اعزاز کی حیثیت رکھے گا اور اگر پیپلز پارٹی کو اپوزیشن میں بٹھایا جاتا ہے تو عوام بہت جلد سڑکوں پر نظر آسکتے ہیں۔اس لیے پیپلز پارٹی کو بھی اس لوٹ مار میں ساتھ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت بھی اب پارٹی کو اسی

سمت میں لے کر بڑھ رہی ہے جہاں لوٹ مار کو تحفظ دینے کے لیے اور سیاسی بقا کے لیے اقتدار میں رہنا ہر صورت میں ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر پیپلز پارٹی دوبارہ اقتدار میں حصہ لیتی ہے تو عوام خود بہت جلد اپنی روایت کے خلاف بھی باہر آ سکتے ہیں اور یہ اس کا آخری اقتدار ثابت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ لینن نے کہا تھا کہ جب لوگ ہاتھ سے ووٹ دے دے کر تھک جاتے ہیں اور اکتا جاتے ہیں تو وہ پاؤں سے ووٹ دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بہت جلد ایک سیاسی ڈیڈ لاک کی صورتحال پیدا ہو گی اور فوج اگر اس کو توڑنے کے لیے آگے آتی ہے تو اس سے ایک عوامی تحریک اور بھی زیادہ مشتعل ہو سکتی ہے۔

باقی تمام امکانات اور تناظر ٹی وی ٹاک شوز میں بہت زیادہ زیرِ بحث لائے جاتے ہیں مگر جو قوی امکان جس پر بحث کم سے کم ہوتی ہے یا اگر ہوتی بھی ہے تو دوسروں کو خوفزدہ کر کے اسے اپنے نقطہ نظر تک محدود یا متفق کرنے کے لیے ہوتی ہے وہ محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور غریب عوام کی تحریک ہے۔ اگر اس وقت ہم مختلف پبلک سیکٹر اور نجی شعبے کے محنت کشوں کی تحریک کی صورتحال کا جائزہ لیں تو فی الحال مایوسی اور ناکامی کے رجحانات حاوی دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن ایک مکمل شکست خوردگی اور پسپائی کی کیفیت بہر حال نہیں ہے۔ گزشتہ برس کے آغاز پر تیونس اور مصر کے انقلابات سے شکتی لے کر پاکستان میں KESC، PIA اور دیگر اداروں کے محنت کشوں کی بھرپور مزاحمت دیکھنے میں آئی جس نے نہ صرف پہلے مرحلے میں انتظامیہ اور حکمران طبقات کو شکست سے دوچار کیا بلکہ ان کے سامراجی آقاؤں اور عالمی مالیاتی اداروں کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بھی بجنی شروع ہو گئی تھیں۔ اگرچہ بعد میں قیادت کے دائیں بازو کی طرف جھکاؤ اور سمجھوتوں کی وجہ سے ایک جیتی ہوئی تحریک کو دوبارہ شکست سے ہمکنار ہونا پڑا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ سب کچھ ضائع ہو گیا ہے بلکہ اسی تحریک سے گھبراہٹ کی وجہ سے ریاست تیزی سے نجکاری کے منصوبے پر عمل نہیں کر پائی ہے اور دوسری طرف اب پیپکو کی تحلیل اور ممکنہ نجکاری کے خلاف واپڈا اور دیگر اداروں کے مزدور ایک دفعہ پھر دبے پاؤں میدانِ عمل میں اترنا شروع ہوئے ہیں۔ محنت کشوں کی سب سے بڑی روایتی ٹریڈ یونین فیڈریشن واپڈا ہائیڈرو

یونین کی قیادت جو ایک طویل عرصے سے بآسانی محنت کشوں کو چھوٹی چھوٹی حاصلات کے لارے میں الجھا کر تحریک کو نکلنے سے پہلے ہی آسانی سے زائل کرنے میں کامیاب ہوتی رہی ہے۔ اب چونکہ چھوٹی سے چھوٹی اصلاح کی بھی گنجائش ریاست کے پاس نہیں ہے بلکہ ردِ اصلاحات کا بھیانک ترین مزدور دشمن ایجنڈے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس قیادت پر بھی شدید دباؤ ہے اور اس نے کئی عشروں کے بعد ایک دفعہ پھر بجلی بند کر دینے کی دھمکی دے کر ریاست کو پریشان کیا مگر اس کے بعد پھر سمجھوتے اور مصالحت کے ذریعے محنت کشوں کو مطمئن کرنے یا دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ قیادت چونکہ مزدور اشرافیہ کی گھناؤنی شکل اختیار کر چکی ہے اس لئے یہ خود بھی ایک حد سے زیادہ نہیں جا سکتی۔ حالیہ غداری سے اگرچہ پھر جزوی طور پر مایوسی غالب آئے گی مگر اگلے مرحلے میں تحریک متبادل قیادت کو تراش لائے گی۔ یہ مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ کچھ طویل ہو سکتا ہے لیکن یہ عبور کرنے کے بعد جونہی محنت کش دوبارہ ابھریں گے تو وہ ملک بھر میں ایک طبقاتی تحریک کو جنم دینے کا باعث بن سکتے ہیں اور اس سے KESC اور PTCL کی زخم خوردہ اور گھائل تحریکوں کا بھی نیا جنم ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی شعبے میں بھی بے چینی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ یہاں بھی توانائی کے بحران کے باعث جہاں بہت زیادہ فیکٹریوں کے بند ہونے کی وجہ سے بیروزگاری بڑھی ہے وہیں کام کرنے والے مزدوروں کی اجرتوں میں بہت زیادہ افراطِ زر کی وجہ سے گراوٹ آئی ہے اور پھر خدمات کے شعبے کی طرح یہاں بھی کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں روک لی جاتی ہیں۔ زرعی مزدور اور کسان بھی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں یوں محنت کشوں کے حالاتِ زندگی ان کو اپنے اندر ایک طبقے سے نکل کر اپنے لیے ایک طبقہ بننے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی چھوٹا سا واقعہ اس طبقاتی لاوے کو پھاڑ سکتا ہے۔ پاکستان کے محنت کش طبقے کی نفسیاتی کیفیت اور تحریک کے تناظر پر کارل مارکس کے یہ الفاظ بالکل صادق آتے ہیں۔ ’’مزدور تحریک کا تناظر بناتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ محنت کش ایک طبقے کے طور پر کیا سوچ رہے ہیں یا محنت کشوں کی مختلف پرتیں کیا سوچ رہی ہیں اور حتیٰ کہ یہ بھی فیصلہ کن نہیں ہوتا کہ محنت کشوں کی سب سے ایڈوانس پرتیں کیا سوچ

رہی ہیں بلکہ فیصلہ کن عنصر یہ ہوتا ہے کہ معروضی حالات اور واقعات کے جبر کے نتیجے میں محنت کش ایک طبقے کے طور پر کونسا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے‘‘۔اور رفتہ رفتہ محنت کشوں کی تمام آپشنز ختم ہو رہی ہیں اور اگر ان کے پاس کوئی آپشن نہیں بچتی تو پھر ایک ہی آپشن ہوگی اور وہ ہوگی صرف اور صرف انقلاب۔

آئندہ دو سالوں میں محنت کشوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کا کردار بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔خاص طور پر ایک لمبے عرصے سے کوئی طلبا تحریک موجود نہیں ہے۔لیکن گزشتہ عرصے میں لاہور گوجرانوالہ، ملتان اور راولپنڈی میں خاص طور پر چھوٹی چھوٹی طلبا ایجی ٹیشن نظر آنا شروع ہوئی ہے۔اتنے شدید معاشی جبر میں یہ ممکن ہے کہ محنت کشوں سے قبل طلبا میں سے بغاوت کا آغاز ہو جائے۔تمام روایتی طلبا تنظیمیں بری طرح بے نقاب ہوئی ہیں۔مذہبی اور فاشست تنظیموں کا کردار بھی ننگا ہو چکا ہے۔ایسی کیفیت میں نوجوانوں کی زیادہ لڑاکا پرتیں ایک متبادل پلیٹ فارم کی تلاش میں ہیں۔اس حوالے سے راولپنڈی میں حال ہی میں تشکیل دیا جانے والا پروگریسو یوتھ الائنس ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

ایک تاخیر زدہ عوامی تحریک سیاست کے افق پر نان ایشوز کی غلاظت، حاوی فکر اور دانش کی پراگندگی، قیادتوں کے مکروہ چہروں اور جعلی اور مصنوعی انقلاب کے نعروں کی سطح کے نیچے تڑپ رہی ہے۔وہ باہر منظرِ عام پر آنے کے لیے درکار توانائی اور شکتی کو مجتمع کر رہی ہے۔اس کا صبر جواب دے رہا ہے مگر ممکن ہے کہ وہ نئے سیاسی سیٹ اپ تک انتظار کر لے گا۔کیونکہ تاریخ عام طور پر بہت کفایت شعار ہوتی ہے۔وہ اس تحریک کے باہر نکلنے کے لیے ضروری ساز و سامان اور اوزار تیار کر رہی ہے۔لیکن اس تاخیر میں سطح کے نیچے ہی اس تحریک کا حجم بڑھتا اور جنون مشتعل ہوتا جا رہا ہے ۔اگر اس کا دم گھٹنا شروع ہو گیا تو یہ یقیناً قبل از وقت بھی سطح کو پھاڑ کر باہر آ سکتی ہے۔اس مرتبہ اس کے جمہوری قتلِ عام کے امکانات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔اگر نظریات سے مسلح اور مقداری اور معیاری حجم کے اعتبار سے تیار قیادت اس تحریک کی رہنمائی کے لیے دستیاب ہوتی ہے تو ان کا امتزاج نسلِ انسانی کا مقدر بدلنے کے لیے کافی ہوگا۔